آنی
فانی
کی
شاعری

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
ریڈر شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی - دہلی

قیمت

چار روپیہ
پچاس پیسے

ناشر
نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔
ٹیلیفون ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۲۲۵۵۹

فہرست

۸۲۲۶

انتساب

جناب محترم سید محمد ٹونکی صاحب

کے نام

ٹونکی صاحب۔ خود شناس فانی نے اپنے کلام کے بارے میں کتنی سچی بات کہی تھی۔

ہمیں ابھی ترے اشعار یاد ہیں فانی
ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

چوں کہ میں نے خود شناسی کا سبق آپ کی بے لوث زندگی سے سیکھا ہے۔ اس لئے اپنی اس کوشش کو آپ کے نام معنون کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ظہیر صدیقی

پیش گفت

گیرم ز داغِ عشق تو طرفے نہ بست دل اینم نہ بس بود کہ جگر رو شناس کیست

جب میں نے طالب علمی کے زمانے میں اپنے ایم' اے کے پرچہ کی جگہ مقالہ داخل کرنے کا خیال ظاہر کیا تو میرے اُستادوں اور دوستوں نے ہمت افزائی کی مگر جب میں نے اپنے مقالہ کا موضوع، "فانی کا غم" بتایا تو عنوان کی ندرت سے بہت سے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی جس میں طنز زیادہ اور استحسان کم۔ بہت سوں کے چہروں پر حقارت آمیز شکنیں نمودار ہوگئیں۔ کسی نے کہا کہ شاید تم میں کوئی بوڑھی روح سما گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ اس دور میں جبکہ زمانہ تیزی سے کروٹ بدل رہا ہے اور دنیا بہجت اور سرور کی جویا ہے، یاس و اُلم کی باتیں کہاں لے کر بیٹھ گئے۔ غرض جتنے منھ اتنی باتیں۔ مگر لطف یہ کہ اس عنوان کی جتنی مخالفت ہوتی رہی، اتنا ہی میرا ارادہ مضبوط ہوتا گیا۔ اور میں نے یہ کہہ کر مقالہ ممتحن کے سپرد کر دیا۔

کیں نورِ چشم ماست کہ با تو سپردہ ایم

مگر یہ سوال اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ آخر ارباب ادب و شعر کی اتنی طویل نہر میں میں نے فانی کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ یہ ایک طویل داستان ہے کہ میں نے فانی کو کن کن منزلوں پر اپنے دل و دماغ کا رہنما پایا۔ زندگی کے کن مرحلوں پر میں نے غم سے محبت کرنا فانی سے سیکھا۔ مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ ابھی اسکول کا زمانہ تھا۔

شعر و ادب کا ذوق ورثہ میں پایا تھا اس لئے ساتھیوں اور استادوں سے اس موضوع پر اکثر گفتگو رہتی۔ ایک دن کسی نے یہ شعر پڑھا۔

یہاں سجدے سے ابتک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہِ محبت میں قدم میرا

شعر میں معلوم نہیں کون سی کشش تھی کہ میں نے ایک بار۔ دو بار۔ تین بار ــــــ اور معلوم نہیں کہ کتنی بار اس شعر کو پڑھا اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف حاصل ہوا۔ وہ پہلا دن تھا جب میں فانی سے مانوس ہوا۔ ۱۹۴۳ئ میں جب علی گڈھ میگزین کا فانی نمبر نکلا تو اتنا شعور نہ تھا کہ اس نمبر کے مندرجہ حقائق کی تہ تک پہونچتا۔ البتہ اسکے اشعار مزے لے لے کر پڑھتا۔ جن اشعار کا مطلب سمجھ میں آگیا ان کا کیا کہنا اور جو سمجھ میں نہیں آئے ان کے بارے میں بقول استاذ محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی "معلوم نہیں کہ کتنی بلند بات کہدی جو ہم نہیں سمجھے"، کہہ کر دل کو سمجھالیا۔ اس عقیدت کے علاوہ میں نے اکثر محسوس کیا کہ فانی کے ساتھ ہمارے نقادوں نے انصاف نہیں کیا۔ خصوصاً اس ترقی پسندی کے دور میں فانی ہمیشہ موردِ الزام رہے۔ کسی نے اگر فانی کے فن کی تعریف بھی کی تو اس کے غم سے بیزاری کا اظہار کیا۔ فانی کے غم کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہے کہ ان کا غم انسانی ولولوں اور ترقی کے جذبے کا منافی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کرکے ان کے غم کا درجہ متعین کردیا جائے۔

پہلے باب میں فانی کی شخصیت کے صرف ان پہلوؤں پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق براہ راست ان کی شاعری سے ہے۔ یہ باب ان کی زندگی کے حالات کی تفصیل نہیں بلکہ ان کی شاعری کے پس منظر کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا باب، غم کی ماہیت اور اس کی اہمیت پر ہے۔ اس میں متفرق یورپین

مفکروں، ناقدوں اور فلسفیوں کے نظریات سے بحث کی گئی ہے جو انھوں نے غم کے بارے میں قائم کئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فارسی اور اُردو شعرا کے یہاں جو غم کے تصورات پائے جاتے ہیں ان پر بھی سرسری نظر ڈالتا ہوا چلا گیا ہوں۔ تیسرا باب ان کے 'فلسفہ غم و عشق' سے متعلق ہے، فانیؔ کے یہاں غم کس راہ سے آیا؟ ان کے یہاں غم کی کیا نوعیت ہے؟ اس غم کے داخلی اور خارجی اسباب کیا ہیں؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ چوتھا باب فانیؔ کے تصوّف سے متعلق ہے۔ یہ ایک الگ حیثیت بھی رکھتا ہے اور تیسرے باب کا ایک جز بھی ہے۔ اس لئے کہ فانیؔ کے یہاں غم، غم عشق اور خصوصاً عشق الہٰی سے عبارت ہے۔ مگر اسکے ساتھ فانیؔ کا تصوّف میرؔ اور دردؔ کے تصوّف سے بہت مختلف ہے۔ یہ تمام مباحث ہیں جن پر اس باب میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پانچواں باب 'فانیؔ میرؔ اور غالبؔ' نہایت فرسودہ عنوان ہے مگر غم اور فلسفہ کے ذکر کے ساتھ ان تینوں کا ذکر ناگزیر تھا۔ بغیر کسی موازنہ کے صرف یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تینوں کے یہاں غم کے کون سے راستے ہیں۔ کہاں تک ان کا غم آپس میں ہم آہنگ ہے اور وہ کون سی منزل ہے جہاں ان کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ چھٹا باب 'فانیؔ اور معترضین' کے عنوان سے عبارت ہے۔ مختلف اوقات میں فانیؔ پر مختلف قسم کے اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ اس باب میں ان کا جواب دیا گیا ہے اور اس طرح ان بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو معترضین فانیؔ پر کرتے رہے ہیں۔ ضمیمہ اوّل میں فانیؔ کے یہاں ایسے الفاظ اور تراکیب کی نشان دہی کی گئی ہے جو عام نہیں ہیں یا فانیؔ نے ان کو زیادہ سلیقہ سے برتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایسے الفاظ بھی شامل کر دئے گئے ہیں جو فانیؔ کے یہاں

نئے انداز سے برتے گئے ہیں۔ ضمیمہ دوم میں اُن کتابوں اور رسائل کی فہرست دی گئی ہے جن سے راقم الحروف نے استفادہ کیا ہے، اسی کے ساتھ ان رسائل کی ایک فہرست بھی شامل ہے جو فانی کے مطالعہ میں مددگار ہو سکتے ہیں آخر میں غزلیات فانی کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ اس انتخاب میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ اس سے فانی کی شاعری کے مختلف ادوار کے ساتھ ان کے رنگ کی ترجمانی بھی ہو سکے۔

آخر میں حضرت قبلہ و کعبہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب کی خدمت میں ہدیۂ نیاز پیش کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے میری جسمانی اور ذہنی تربیت فرمائی جس کی بدولت میں اس مسودہ کو پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ برادر محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب (صدر شعبہ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کا سپاس گذار ہوں جنھوں نے فانی کے فلسفیانہ مزاج کو سمجھانے میں مدد دی۔ میں اپنے دوست رشید حسن خانصاحب کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے ہمیشہ اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود مجھے مفید مشورے دیئے۔ اس دور میں جب کہ طباعت و اشاعت کا مسئلہ ہفت خواں سے کم نہیں، محترم نسیم انہونوی صاحب نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری لے کر میری مشکل کو آسان بنا دیا۔ جس کے لئے تہ دل سے متشکر ہوں۔

شعبۂ اُردو۔ دہلی یونیورسٹی
۱۵ر اگست ۱۹۶۸ء

ظہیر احمد صدیقی

فانی کی شخصیت

ہماری المیہ شاعری کی کہانی میر کی پُر درد زندگی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ غم نصیب شاعر ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوتا ہے جہاں اس کو غم عشق کے ساتھ غم روزگار سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ کتاب الم کا دوسرا باب مغلیہ دور کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی زندگی سے شروع ہو کر دہلی کی تباہی پر منتہی ہوتا ہے۔ اسی کہانی کی تیسری قسط فانی کی روداد غم ہے۔ جو ان کی ذات سے شروع ہو کر انھیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ ان تمام غم نصیب شاعروں میں دو شخصیتیں سب سے پیش پیش نظر آتی ہیں۔ میر اور فانی۔ دونوں کا غم ذاتی ہے مگر ذاتی تجربات نے آفاقی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ یہ دونوں اپنے میں ڈوب کر کائنات پر چھا جاتے ہیں۔ اور کہیں وجدان کی سرحدیں پار کر کے کائنات کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ ان دونوں کا تصور غم اور فلسفۂ زندگی اپنا ہے مستعار نہیں۔ غم کا کون سا پہلو ہے جس سے وہ ناآشنا ہوں۔ اور اذیت کی کون سی سرحد ہے جس کو انھوں نے پار نہ کیا ہو۔ ان دونوں کے غم کے بارے میں آئندہ صفحات میں تفصیل سے بحث کریں گے۔ سردست ہم کو فانی کی شخصیت کا مطالعہ کرنا ہے۔ جس سے ان کی شاعری کا پس منظر اجاگر ہو جائے۔

فانی ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو اسلام آباد (بدایوں) میں پیدا ہوئے۔ شاہ عالم کے عہد میں ان کے مورث اعلیٰ اصالت خاں کابل سے آئے اور دربار دہلی سے

وابستہ ہوگئے۔ مغلیہ سلطنت نے جوہر شناسی اور قدردانی میں امتیازی حیثیت کی مالک تھی، خطابات۔ جاگیر اور منصب سے اصالت خاں اور ان کے بعد ان کی اولاد کو خوب نوازا۔ نواب بشارت خاں فانی کے پردادا بدایوں کے گورنر مقرر ہوئے۔ فانی کے سلف کی داستان خود فانی کی زبان سے سنئے :-

"میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دنیا میں لایا گیا، اب تک کہ دسمبر ۱۹۴۰ء ہے۔ خود کو زندہ سمجھتا ہوں۔ نسلاً پٹھان ہوں۔ اصلی وطن کابل ہے۔ اسی طرح کہ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں میرے مورث اعلیٰ اصالت خاں نامی ہندوستان آئے۔ دربار دہلی نے انہیں اور ان کے جانشینوں کو بہت کچھ نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فائز کئے جانے کے علاوہ جاگیرات۔ خطابات۔ منصب وغیرہ سے سرفراز کئے گئے۔ نواب بشارت خاں مرحوم میرے پردادا تھے، صوبہ بدایوں کے گورنر تھے تقریباً دو سو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچا دی کہ میرے والد محمد شجاعت علی خاں صاحب جو مورث اعلیٰ سے چھٹی پشت میں تھے پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چناں چہ قلیل آمدنی کے سہارے پر مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت۔ دیانت۔ غیرت اور جرأت کے ساتھ گذار دی"۔

فانی نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ فراغت کی زندگی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ پولیس کی ملازمت کی آمدنی اس جاگیر کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی۔ جو دو سو مواضعات پر مشتمل تھی۔ تاہم ایک آسودہ زندگی بسر کرنے کے لئے کافی تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء

لہ۔ خود نوشتہ تذکرہ رسالہ نگار جنوری۔ فروری سنہ ۱۹۴۱ء

میں انھوں نے بی، اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد لکھنؤ۔ آگرہ۔ بدایوں اور بریلی میں وکالت کی۔ جس سے ان کو دلچسپی نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ یہ پیشہ سازگار نہ آیا۔ ۱۹۳۲ء میں وکالت ترک کر کے حیدر آباد میں صدر مدرس کے عہدہ پر مامور ہوئے[1]۔ آخر ۱۹۳۹ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد وفات تک وہ مالی مصائب اور ذہنی الجھنوں میں گرفتار رہے۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

مصیبت بالائے مصیبت مہاراجہ سرکشن پرشاد جو فانی پر خاص کرم کرتے تھے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب فانی کی زندگی ایک ایسے دور سے گذر رہی تھی جس میں ہر طرف مایوسی و ناکامی نظر آتی تھی۔ احباب نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ فانی کی المیہ زندگی کا شباب قیام حیدر آباد سے متعلق تھا جب کہ وہ منازل نشیب طے کر رہے تھے۔ آخر ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو انھوں نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی[2]۔

لو آج مرگ فانیٔ بے کس سے مٹ گئی   وہ اک خلش جو خاطر اہل وطن میں تھی

فانی کی موت پر فراق کے یہ الفاظ ایک ادبی دستاویز ہیں۔

---

[1] - خود نوشتہ سوانح، نگار جنوری ۱۹۴۱ء

[2] HE RESTS HIS HEAD UPON THE LAP OF EARTH A YOUTH TO FORTUNE AND TO UNKNOWN, FAME FAIR SCIENCE FROWN'D NOT ON HIS HUMBLE BIRTH AND MELANCHOLY MARK'D HIM FOR HIS OWN.

"ہندوستان کی بدلتی ہوئی زندگی اور شاعری کی طرف سے اے تصور غم و مصور الم۔ اے لاثانی فن کار۔ اے ہماری تہذیب کے۔ انسانی شرافت کے۔ ہمارے دکھ درد کے نمائندے۔ اے درد زندگی کے مترنم ساز۔ اے تبسم تکلمے۔ تکلم ترنمے۔ اے انسانی زندگی کی مجبوریوں اور کمزوریوں کو اپنے آنسوؤں سے سینچ کر پاک بنا دینے والے۔ اے ناز حیات۔ ہماری ڈبڈبائی آنکھوں کا سلام لے۔ تو ہماری دنیا میں تھا۔ تو کیا گیا کہ ؏

دنیا گذر گئی غم دنیا لئے ہوئے"

فانی کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان کی زندگی اور سیرت کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنا ضروری ہے جن کے بغیر یہ تصویر نامکمل رہے گی۔ ایک بڑے فن کار کی افتاد طبع اس کی زندگی اور آرٹ پر حاوی ہوتی ہے۔ ہر فرد کو خدا نے ایک مخصوص قسم کا مزاج عطا کیا ہے۔ اور اسی 'انداز قد' سے ہر محفل میں پہچانا جاسکتا ہے۔ کسی کا مزاج شعر و نغمہ کا خوگر ہے اور کوئی طبعاً سائنس اور فلسفہ کی طرف مائل ہے۔ اسی طرح کوئی شاعر اپنے ماحول میں نشاط و شادمانی کے سامان دیکھتا ہے مگر اپنی غم پسندی کے باعث عیش کے نغمے گا نہیں سکتا۔ اس کے برخلاف دوسرے ایسے شعرا بھی تھے جن کو غم و الم سے سابقہ رہا مگر انھوں نے ہر غم کو قہقہوں میں اڑا دیا۔ زندگی دونوں کے یہاں موجود تھی مگر مزاجوں کے اختلاف نے زندگی کے رخ بدل دئے۔ کسی بھی شاعر کی سیرت کی سب سے بڑی سند اس کا کلام اور اس کے ہم عصروں کی شہادت ہوتی ہے۔ جن سے اس کی زندگی کا ہر گوشہ بے نقاب ہوتا ہے۔ آئیے ان

لہ۔ فانی بدایونی۔ فراق گورکھپوری۔ علی گڑھ میگزین فانی نمبر

دونوں اسناد کی روشنی میں فانی کی سیرت کا جائزہ لیں۔

فانی ایک خوددار اور عالی ظرف انسان تھے۔ اور سچ پوچھیے تو اسی خودداری کے باعث وہ زندگی میں ترقی نہ کر سکے۔ انھوں نے دولت کو اس وقت ٹھکرا دیا جب ان کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں

"جو شعرا صحیح معنی میں شعرا تھے یا ہیں۔ وہ شعر کو اس کے صحیح درجہ سے گرانے کے لئے نہ کسی قیمت سے خریدے جا سکتے ہیں۔ اور نہ کسی قوت سے مرعوب ہو سکتے ہیں۔ وہ ہر مصیبت کو جو اس مسلک کی بدولت ان پر ٹوٹتی ہے خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے ہیں اور برداشت کرتے رہیں گے"[1]

ان کے کلام میں بھی اس قسم کے دلچسپ اشارے مل جاتے ہیں۔

اس بحرِ بے کراں میں ساحل کی جستجو کیا کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار کر جا

تنگ ہے سعیٔ عرضِ محبت، فرضِ محبت پورا کر

اس کے سوا کچھ یاد نہ رکھ بھولے سے اثر کا نام نہ لے

دل کے سوا یہاں کوئی محرمِ دردِ دل نہیں بے خبروں سے کیوں کہیں اہلِ خبر سے کیا کہیں

اس وقت جب کہ دنیا والوں کی نگاہیں فطرتاً ناخدا پر ہوتی ہیں۔ فانی کی غیرت لنگر اور ناخدا دونوں سے بے نیاز تھی۔ ان کو خدا کے بعد اپنے دست و بازو پر ناز تھا۔

لنگر کا آسرا ہے نہ تائیدِ ناخدا میرے سپرد ہے مری کشتی خدا کے بعد

یہ کوئی شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ فانی کی زندگی کا سچا مرقع ہے۔ ان کا حال کبھی "منت کشِ زباں" نہ ہوا۔ وہ خود ہی "تجلی" بنتے ہیں اور خود ہی پروانہ، وہ اپنے "حرم"

---

[1] شعر و شاعری۔ فانی بی۔ بی۔ سی۔ ریڈیو نمبر جنوری ۱۹۴۱ء

کی بدولت' ہر منزل و ہر جادہ' سے گذر جاتے ہیں۔ ان کی خود اعتمادی کی شان یہ ہے۔

ہر کلمۂ الحق میں اک کیف انا بھر دوں تو بہ سے جو ٹکرا دوں اُلٹا ہیہ ایمانہ

فانی درباروں میں ہوں یا سرکاروں میں۔ حسن و عشق کی محفلوں میں ہوں یا کسب معاش کی منزلوں میں جہاں سے گذرے اپنی خودداری کو سنبھالے ہوئے گذرے۔ فانی کے حالات کا بغور مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ ان کی زندگی اور ماحول میں کوئی انقلاب نہیں ملتا۔ جو کسی شاعر یا فرد کی زندگی میں تہلکہ مچادیا کرتا ہے جو نشیب و فراز ان کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔ ان کی حیثیت سیلاب یا طوفان کی نہیں ہے بلکہ جوار بھاٹا کی سی ہے جو چند لمحات کے لئے تو غضب ناک ہو سکتا ہے ورنہ سکون اور خاموشی ہی نظر آئے گی۔ اس کا بڑا سبب فانی کا بے نیازانہ طرز عمل تھا جس نے کبھی تمناؤں کو اجازت نہ دی کہ وہ خروش اور ہنگامہ پیدا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ نا فہم فانی کے کلام اور ان کی زندگی کے سکون اور تحمل کو' سکون مرگ' سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔

وہ قدرت کی طرف سے ایک حساس دل لے کر آئے تھے اور اسی حساس دل نے ان کو المیہ شاعر بنا دیا۔ کسی کا قول ہے" احساس رکھنے والوں کے لئے زندگی ایک المیہ ہے" وہ اس المیہ زندگی کے اس قدر خوگر ہو گئے کہ 'حصول غم' ہی ان کے واسطے' حصول عشرت' تھا۔ فانی نے کچھ عرصہ وکالت بھی کی مگر جس دنیا میں جھوٹ اور ریاکاری کی گرم بازاری ہو۔ جہاں انصاف کے نام پر انسانیت کا گلا کاٹا جاتا ہو۔ جہاں مزدور اور کسان اپنے خون پسینے کی کمائی سرمایہ داروں کے آستانوں پر لٹا دیتے ہوں۔ اس سے

اور فانی دو متضاد لفظ بن کر رہ گئے۔

فانی کی زندگی کو جن لوگوں نے قریب سے دیکھا ہے وہ ان کی زندگی کا اہم جزو ان کی تواضع اور انکسار کو بتاتے ہیں۔ ان کے مزاج میں خاموشی کے ساتھ ایک خاص قسم کی سنجیدگی تھی جس سے ناواقف مرعوب ہو جاتا اور جس کو اجنبی تمکنت و غرور پر محمول کرتا۔ اسی کے ساتھ جب وہ مخصوص احباب سے ملتے تو یہ نہ پتہ چلتا کہ اس ہنسنے والے شخص کی زندگی کی داستان کتنی المناک ہے۔ انھوں نے اپنی حالت کا ذکر کبھی احباب کے سامنے نہیں کیا اس سے ان کے ضبط اور اعلیٰ کردار کا پتہ چلتا ہے۔ قاضی عبدالغفار کلیات فانی کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ان کے آنے سے پہلے میں ان کا کلام سنا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ شاعر اچھا ہے معلوم نہیں کہ آدمی کیسا ہے ——— ؟ جب ان کو دیکھا تو معلوم ہوا جتنا کہ وہ شاعر ہے اس سے زیادہ انسان ہے"[۱]

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:-

"میں کسی دوسرے شاعر کو نہیں جانتا جس نے اپنی شاعری کو اپنی زندگی کے تاثرات۔ اپنی حقیقی واردات قلب اور اپنے تمام تر انسانی احساسات کا اس قدر صحیح آئینہ دار بنایا ہو۔ فانی کی شاعری یکسر خود فانی ہی کی ہجو اور روح ہے۔ اس شاعری کو فانی کی روح سے الگ کر لیجئے یا فانی کی روح کو اس شاعری سے خارج کر دیجئے (گو یہ دونوں باتیں ممکن نہیں) تو کیا رہ جاتا ہے ان اوراق میں۔ سوائے ایک وحشت زدہ اور ویران خلا کے"[۲]

فانی کی شاعری

فانی کی زندگی کے دو پہلو ہمیشہ نمایاں رہے ہیں میری مراد ان کے غمِ دوراں
اور غمِ جاناں سے ہے۔ غمِ جاناں کے تصدق میں زمانے کا غم فراموش تو
نہ کر سکے مگر اس کی بدولت ان کا ذہنی بوجھ ہلکا ہو گیا۔ فانی کو زندگی میں عشوہ
و ناز و ادا سے بھی واسطہ پڑا۔ خوبانِ روزگار کے ستم بھی برداشت کئے مگر انہوں
نے اپنی محبت کا کبھی سودا نہیں کیا۔ کسی سے اس کا نظریہ محبت دریافت کیا گیا
تو اس نے کہا کہ "محبت صرف محبت کے لئے کرنا چاہیئے"

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دُور

فانی کی محبت بے لوث اور بوالہوسی سے پاک تھی۔ تعجب یہ ہے کہ جس کوچہ میں
جرأت، مومن اور داغ بدنام ہو گئے۔ وہاں سے فانی اپنا دامن بچا کر لے
آئے۔ مجازی عشق کے باوجود انہوں نے مجاز کی آلودگیوں سے دامن کو
ملوث نہ ہونے دیا۔ مولوی وحید احمد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"راوی معتبر یہ کہتا ہے کہ پاک محبت تھی اور مجھے اس میں ذرا بھی
تامل نہیں۔ اگر پاک محبت نہ ہوتی تو یہ سوز و درد نہ ہوتا۔ غمِ عشق اور
غمِ روزگار دونوں کو فانی نے گوارا کیا۔"[1]

عشق خواہ مجاز کے رنگ میں ہو یا حقیقت کے۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا
محرک تھا۔ اس عشق نے ان کی شخصیت کی تکمیل کی اور اسی کے ذریعے ان میں
وہ احساس پیدا ہوا جس کو جمالیاتی حسن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عشق کی بدولت
ان میں وہ پاکیزگی اور لطافت پیدا ہوئی جو اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔ وہ غم کے
بوجھ کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اگر محبت کا جذبۂ لطیف اس کو ہلکا نہ کر دیتا جیسے

[1] یادِ ایامِ عشرت فانی۔ وحید احمد علی گڑھ میگزین فانی نمبر

مجازی عشق کی قوت کا یہ عالم ہے تو عشق حقیقی کی گیرائی اور گہرائی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس میں بھی فانی کی انفرادیت ہر ہر قدم پر دامن دل کھینچتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اور ہی بل ہے تری زلفوں میں آج — کون گرفتار بلا ہو گیا
سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا
تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا — ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا
چھین لیا تیری محبت نے مجھے — اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

وہاں سجدے سے ابتک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا

زندگی کے اس پیچ و خم سے گذرتے ہوئے فانی کی المیہ زندگی آگے بڑھتی ہے۔ مگر ہر قدم ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ اور ہر ارادہ ایک ٹوٹنے والی امید کی تمہید ہوتا۔ زمانے کی کج ادائیاں۔ محبت کی ناکامیاں۔ عزیزوں کی بے وفائیاں اور ابنائے دہر کی ناقدر شناسیاں، ان کی زندگی کا عبرتناک مرقع تھیں۔ ان شعروں کے طرز کارکی کتنی صحیح ترجمانی انھوں نے کی ہے۔

آرام کے ساتھی ہیں فراغت کے شریک — البتہ نہیں گردش قسمت کے شریک
غمخوار خدا نخواستہ کیوں ہوتے — احباب کا مفہوم ہے راحت کے شریک

وطن والوں کی بے رخی اور تلاش معاش کی سرگردانی نے ان کو در در کی خاک چھنوائی مگر وطن سے جس قسمت کو لے کر چلے تھے غربت میں بھی وہی ساتھ رہی آرام نہ وطن میں میسر ہوا اور نہ فراغت کی زندگی غربت میں پا سکے۔

گردش وہی یہاں بھی سپہر کہن میں تھی
غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

فانی کے تخلص کو صرف شاعرانہ اعتبار سے ہی اہمیت حاصل نہیں ہے بلکہ اس تخلص کی روشنی میں ان کی زندگی کی بڑی گہری نفسیاتی حقیقت پوشیدہ ہے کہ انھوں نے عیش و عشرت کو کبھی باقی نہ جانا۔ اپنے دل کو آرزوؤں کا مدفن بنا دیا جہاں امید نے کبھی بسیرا نہیں لیا۔ فانی کے مذاق زندگی کا یہی رجحان تھا جس نے شوکت سے فانی کی طرف مراجعت کی۔ فانی کی ذات اپنے دور ہی کے نہیں بلکہ تاریخ ادب اردو کے ان چند نفوس میں سے تھی۔ جن کے یہاں زندگی اور شعر میں کامل آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات کا مطالعہ کر جائیے۔ اس میں صرف وہی عنوانات ملیں گے جن کو فانی نے قریب سے دیکھا ہے اور پرکھا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے نظری اختلاف تو ممکن ہے مگر فانی کی "چشم حقیقت نگر" سے دیکھئے تو اس کی صداقت کا پتہ چلے گا۔ ان کی شاعری کے موضوعات غم۔ عشق۔ جبر۔ ہمہ اوست۔ ناپائداری دنیا۔ بے ثباتیِ کائنات کسی بھی عنوان کو لے لیجئے اور فانی کی زندگی سے ان کا رشتہ ملائیے ان میں وہی صداقت ملے گی جو ایک سچے انسان اور سچے فن کار کے یہاں ضروری ہے۔ فانی کی سیرت اور کردار کے بارے میں ان کے ہم عصروں کی ایک ہی رائے ہے کہ وہ خوددار۔ بے باک اور مذہبی اقدار کا احترام کرنے والے تھے۔ ان میں چند کی رائیں یہاں بیان کرنا شاید بے محل نہ ہوں۔

جگر مرادآبادی : ——— وہ ایک یار بے تکلف تھے، سراپا خلوص اور مجسم شرافت۔ ان کے خلاف اکثر سازشیں ہوتی رہیں۔ لیکن ہمیشہ بے نیازانہ دامن بچاتے رہے۔ ان کے نام نہاد احباب نے بارہا ان کو دھوکے دئیے لیکن وہ ہمیشہ دھوکے کھاتے رہے۔ یہ نہیں کہ فانی ایک سادہ لوح انسان تھے۔

دراصل وہ بے حد ذکی۔ حساس اور صاحب بصیرت و فراست تھے۔ ان کی نظرت بلند تھی اس لئے وہ ہمیشہ درگذر سے کام لیا کرتے تھے[1]

قاضی عبدالغفار :— ان کے شخصی کردار میں خودداری ایک بہت نمایاں اور طاقت ور عنصر ہے۔ انھیں شاعروں میں دیکھا۔ گھر کے صحنوں میں دیکھا۔ تخلیہ میں — جب میرے اور ان کے سوا کوئی موجود نہ ہوتا تھا۔ دیکھا۔ تکلف اور بے تکلفی دونوں حالتیں دیکھیں لیکن وہ جوان کے کردار میں ایک شانِ تمکنت اور خودداری کا دبدبہ دیکھا وہ ایسا تھا کہ ان کے بے تکلف دوست بھی متاثر اور مرعوب ہوا کرتے تھے[2]

رشید احمد صدیقی :— فانی نے تمام جذبات و حیات کی ترجمانی کی ہے لیکن ہر جگہ ان کا دل کش انفرادی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ اقبال کی مانند ان کا کلام مطالعہ کرنے سے یہ کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اردو شاعری کی فرسودہ اور پامال شاہ راہ سے گذر رہے ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ دونوں نہایت محنت اور کشادہ جبینی کے ساتھ مختلف زبانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ مختلف سوسائٹیاں دیکھی ہیں۔ مختلف مراحل و منازل طے کئے ہیں[3]

محمد سبطین احمد :— فانی کی فطرت اپنی انفرادیت ہر جگہ نمایاں کرنا چاہتی تھی۔ ان کا طرز بود و باش اور ان کا انداز گفتگو اک شان انانیت رکھتا تھا۔ [illegible] میں تکلف ہوتا تھا۔ غصہ کبھی نہ آتا۔ بازاری الفاظ یا سوقیانہ کلمے منھ سے [illegible] فانی کا طرز گفت و شنید بڑے خود سر دل کو ان کی شخصیت

۱۔ فانی میری [illegible] علی گڑھ میگزین (فانی نمبر)

۲۔ مقدمہ کلیات فانی قاضی عبدالغفار

۳۔ مقدمہ باقیات فانی رشید احمد صدیقی

کا احترام کرنے پر مجبور کر دیتا۔[1]

ماہر القادری: فانی مرحوم خوش پوشاک اور خوش خوراک تھے۔ اوقات کی پابندی کا بہت لحاظ رکھتے۔ مذہبیت ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک زمانہ میں نماز اور تلاوت قرآن کے بہت پابند تھے مذہبیت کی یہ چنگاری مرتے دم تک اپنا کام کرتی رہی۔ انقلابی قسم کی ملحدانہ شاعری سے ان کو انتہائی نفرت تھی۔ فانی کا خط بہت پختہ اور دیدہ زیب تھا۔ زیادہ تیز لکھنے کے عادی نہ تھے۔[2]

اشعار ذیل سے ان کی افتاد طبع کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

رہی جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز	کوئی تو اہلِ رضا کا مزاج داں ہوتا

تو نے دل دے کے بس اک شان ہوس پیدا کی
ان کا بندہ ہے تو ناز ان رہی شان بھی لا

تجھ کو پھبتا نہیں اسلام کا دعویٰ فانی
ورنہ وہ غیرت اسلام بھی لا۔ آن بھی لا

ہٹئے خزاں سے مست ہیں یا ہمیں بہار کیا	ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا
موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی	گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے
کیا کروں ناز کی بہت ہے انکی رضی کا سوال	ورنہ فانی اس جئے جانے سے کچھ حاصل نہیں
رہ پائے شوق ٹے کہ جہت آشنا نہ ہو	پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں
غم کو جو خوشی بنا کے چھوڑے	فانی وہ نصیب چاہتا ہوں
لذت کش آرزو ہوں فانی	دانستہ فریب کھا رہا ہوں
تا عرصِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ	اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

[1] تصویر فانی محمد سبطین ... فانی نمبر
[2] فانی مرحوم ماہر القادری علی گڑھ میگزین (فانی نمبر)

فلسفۂ غم --- اس کی ماہیت اور اہمیت

غم کیا ہے ؟ اس کا وجود کیوں ہے ؟ اس کا جواب ہر فلسفی اور مفکر اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق دے گا۔ زرتشت اس کو خیر و شر یا نور و ظلمت کی آویزش۔ اہرمن کی عارضی فتح سے تعبیر کرے گا۔ یورپ کا خدا مست فلسفی اسپنوزا (SPINOZA) اس کو جزوی یا محدود نقطہ نظر کا نتیجہ بتائے گا۔ ہارڈی اس کو ایک بے رحم اور ظالم نیچر کی کارفرمائی پر محمول کرے گا۔ ایک صوفی کے نزدیک یہ احساس انفرادیت یا دردِ جدائی کا لازمہ ہوگا۔ اقبال اس کو خودی کی آزمایش اور ارتقائے خودی کی لازمی شرط قرار دے گا۔ ایک ماہر نفسیات بتائے گا کہ یہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہماری خواہشات کی تسکین میں موانع پیش آنے سے پیدا ہوتا ہے۔ غرض جواب غم کی تعبیر کچھ ہی کیوں نہ کی جائے زندگی میں غم کے وجود سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔ یورپ کے لذت پرست (HEDAUNIST) فلسفی جو حصول مسرت کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے ہیں۔ وہ بھی اس آب حیات کو اسی ظلمت کی راہ سے ڈھونڈھنے پر مجبور ہیں۔ غم کے کانٹوں سے دامن بچا کر وہ گل مراد تک پہونچنے کی امید کرتے ہیں۔ کچھ لوگ غم کے وجود کے قائل ہوتے ہوئے بھی ہمیں اکثر و بیشتر غم کی اہمیت کے منکر نظر آئیں گے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو وہ ہیں جنھوں نے ناز و نعم کی گود میں پرورش پائی ہے۔ عیش و عشرت کے جھولوں میں آنکھیں کھولی ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ زندگی کے روشن رخ کو دیکھا ہے۔ ان کے دل غم کی لذت سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے غم کی عظمت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کچھ لوگ عیش و عشرت کی ظاہری رنگینی اور عارضی چمک دمک سے اس قدر مسحور و مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اسی کو سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں اور رات دن اسی کی تلاش میں سرگرداں پریشاں رہتے ہیں۔ عنقائے مسرت کی تلاش ان کی زندگی کو پر از غم و آلام بنا دیتی ہے اور غم و آلام کی موجودگی انھیں اور بھی مسرت کے لئے بے چین کرتی ہے۔ ان کے علاوہ بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو غور و فکر کے عادی نہیں وہ دوسروں کو ایک مقصد کے پیچھے بھاگتے دیکھتے رہتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ان کی زندگی کا بھی یہی مقصد ہونا چاہیئے۔ وہ دوسروں کو مسرت کا دیوانہ اور غم سے بیزار پاتے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اسی نظر سے غم و مسرت کو دیکھنے لگتے ہیں یہ لوگ اپنے کھلے قہقہوں سے اہلِ غم کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اپنے سطحی معیاروں سے نعمت غم کی تحقیر کرتے ہیں۔

غم زندگی کی خودنگری کا دوسرا نام ہے۔ غم سنجیدہ تفکر کی دعوت ہے۔ غم ہی سے انسان عرفان نفس اور اندازۂ کائنات حاصل کرتا ہے۔ فلسفیانہ تفکر کے آغاز کی تاریخ بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ انسان نے زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے اور راز حیات کو سمجھنے کی کوشش اس وقت شروع کی جب وہ موت کی تلخیوں سے دوچار ہوا۔ بچھڑے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کے غم نے انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ زندگی کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کا آغاز و انجام کیا معنی رکھتا ہے؟ تمام زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسرت کے نشے میں ہمارا ذہن زیادہ سوچنے

کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ ہم چیزوں کے ظاہری انداز و سطحی پہلوؤں پر قناعت کرتے ہیں اور ان سے آگے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن اگر ذرا غم کی چوٹ دل پر پڑنے دیجئے تو یہی نہ سوچنے والا انسان اب فلسفیانہ گتھیوں میں الجھا ہوا نظر آئے گا۔

غم کے جذبات میں جو شدت اور گہرائی ہوتی ہے وہ خوشی میں نہیں۔ اکثر اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ خوشی کی لہریں ہماری ذات کی اوپری سطح ہی کو متاثر کر رہی ہیں یا صرف ہمارے ظاہر کو چھو رہی ہیں۔ لیکن غم ہماری روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور ہماری کل ہستی کو متاثر کرتا ہے۔ غم ایک پائندہ حقیقت ہے اور خوشی ایک آنی جانی چیز۔ غم اس باغ ہستی کا مستقل رنگ ہے اور مسرت ایک عارضی بہار۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز خوشی اور مسرت کے عارضی وقفوں کے بعد بار بار اپنے اصلی رنگ ہی کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر مقدار اور تناسب کے اعتبار سے بھی غور کیا جائے تو خوشی صرف چند خوش نصیبوں کے حصہ میں ملے گی۔ باقی انسانوں کی وسیع اکثریت غم واندوہ سے ہم کنار نظر آئے گی۔

غم میں ایک اجتماعیت ہے۔ غم ایک اہم حیاتیاتی مقصد کو پورا کرتا ہے۔ غم ہمیں دوسروں کی مصیبت میں شریک ہونے کے بعد اس کے درد سے متاثر ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ غم انسان کو خود غرضی اور نفس پرستی سے دور کرتا ہے ہوس کے شعلوں کو بجھاتا ہے اور اخلاقی حس کو بیدار کرتا ہے۔ غم تزکیہ نفس اور اصلاح حیات کا ذریعہ ہے۔ غم ہی انسان کو حاضر و موجود سے بےزار بنا کر ایک بہتر نظام حیات اور ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ اور انقلاب کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ انسانیت کے جتنے محسن اور سوسائٹی کے جتنے مصلح گذرے ہیں انھوں نے غم کے مکتب ہی میں تربیت پائی ہے۔ غم کی آنچ ان کے عزم کو آہنی بناتی ہے، ان کے گرد

میں پختگی پیدا کرتی ہے۔ غم عمل کے منافی نہیں۔ غم انسان کو ادنا منفعتوں اور سطحی مصلحتوں سے بے پروا بنا کر زندگی کے اعلا مقاصد اور اہم قدروں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور احساس فرض کو ابھارتا ہے۔ غم کی شدت ہی میں انسان ایسی ایسی مشکلات کو عبور کر لیتا ہے اور ایسی ایسی آزمائشوں سے گذر جاتا ہے جن کا تصور بھی معمولی حالت میں اس کو لرزہ بر اندام کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس موقع پر کہا جائے کہ فراوانیٔ غم ہی کبھی کبھی خودکشی کا باعث بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ غم کا قصور نہیں بلکہ خودکشی کرنے والوں کے ظرف کا قصور ہے۔ اس کے علاوہ اگر غور کیجئے تو یہ مسرت پرستی کا جذبہ ہی ہے جو انسان کو خودکشی کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ مسرت کو زندگی کا مقصد سمجھنے والا انسان جب اپنے مقصود سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کو بے قیمت سمجھ کر اس کا خاتمہ کرنے پر تُل جاتا ہے لیکن جو لذتِ غم سے واقف ہے وہ کبھی اس کم ظرفی اور بد ذوقی کا مرتکب نہ ہوگا۔

غم اور فلسفہ کے تعلق کے بارے میں اس مضمون کے آغاز میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر ہم دنیا کے بعض اہم فلسفیانہ نظریوں یا فلسفیوں کو اپنی تائید میں پیش کریں۔

یونان قدیم کا قنوطی فلسفی ہریکلٹس HERACLITUS زندگی کی گہرائیوں میں غم کی موجوں کو جاری و ساری دیکھتا ہے اور پیہم تغیرات سے درس غم لیتا ہے۔ سقراط کا یہ قول آج تک فلسفۂ اخلاق کے نظریوں کا زیب عنوان ہے کہ "میں تلاش مسرت کے مقابلے میں موت کو ترجیح دوں گا۔" سقراط کی تعلیم کے اس پہلو نے اخلاق کے بعض اہم نظریوں میں نشو و نما پائی۔ مثلاً رواقیت (STOICISM) کلبیت (CYNICISM) وغیرہ۔ درد و غم سے ساز اور مسرت کی نفی ان نظریوں کا اہم جزو مشترک ہے (جرمن کا فلسفی اعظم کانٹ

(KANT) جس نے جدید فلسفہ میں ایک زبردست انقلاب کی بنیاد ڈالی۔ تلاش مسرت کو اپنے اخلاق کا شجر ممنوعہ قرار دیتا ہے اور عیش و عشرت کی فراوانی سے اخلاقی عظمت کو بے نیاز ثابت کرتا ہے۔ افلاطون تغیرات کی اس دنیا سے جس کو وہ "غیر حقیقی شہود" قرار دیتا ہے وہ غیر مطمئن نظر آتا ہے۔ اور "تصورات کی دنیا" کے لئے بے چین۔ نو افلاطونیت کا بانی پلاٹینس (PLOTINUS) روح انسانی کو وجود حقیقی سے بتدریج ماخوذ مانتا ہے اور اپنے مرکز اصلی کی طرف لوٹنے کی تڑپ کو انسانی زندگی کا ماحصل قرار دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں روح انسانی چونکہ اپنے سرچشمۂ حیات سے گر کر اس زندگی کے اسٹیج پر پہونچا ہی اس کی پستی اور مصیبت کا باعث ہے پھر اس بلندی پر پہونچنے اور اپنی کھوئی عظمت کو حاصل کرنے کی خواہش اس کو اس زندگی سے غیر مطمئن اور بے زار رکھتی ہے۔ قرون وسطیٰ کے عیسائی فلسفیوں کے یہاں اس عقیدہ نے گناہ اولین (ORIGINAL SIN) اور ہبوط آدم DESCEN TOF ADAM کی صورت اختیار کر لی اور اس کی بنا پر کل نسل آدم ذاتی نزاع اور ساری انسانی زندگی مصائب اور غم کا مجموعہ قرار پائی۔ دور جدید کے فلسفیوں میں اسپنوزا (SPINOZA) نے عقیدہ جبر سے اپنے فلسفہ زندگی میں غم اور افسردگی کی آمیزش کی لیکن جرمنی کا مجذوب فلسفی نطشہ (NIETSCHE) کہتا ہے کہ "تمام ترقی درد کو روحانیت میں تبدیل کرنے کا نام ہے۔" دور حاضر میں شریعت غم کا بنیادی جس فلسفی کو بنتا تھا وہ آرتھر شوپنہار ARTHER SHOPENHAUER ہے۔

یہاں پر شاید یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ یورپ میں دو گروہ تھے ایک کا مسلک رجائیت تھا اس کا علمبردار لائبنز ہے اور دوسرے کا قنوطیت اور قنوطیت کا نمائندہ شوپنہار ہے۔ لائبنز کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خیر ہے اگر

یہاں بُرائیوں کا کچھ وجود بھی ہے تو اس لئے کہ دنیا مکمل نہیں ہے اور ناقص چیز کی تعریف یہی ہے کہ اس میں کچھ کمی رہ جائے۔ اس کمی کو پورے طور پر تو نہیں البتہ ایک حد تک دور کیا جا سکتا ہے۔ مکمل طور پر دور اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ کامل ذات صرف خدا کی ہے اگر وہ کائنات کو بھی کامل پیدا کرتا تو یہ اس کی ہم سری کا دعویٰ کرتی۔ اس کے برخلاف شوپنہاور کہتا ہے کہ "دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ"۔ دنیا میں قابلِ رشک کوئی نہیں۔ قابلِ رحم بہت ہیں!! "مشیت بہ نفسہٖ اندھی اور غیر ذی شعور ہے"۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس دنیا میں ایک لمحہ کے واسطے بھی رکنا نہیں چاہتا۔ وہ اس سے فرار اختیار کرتا ہے اس لئے وہ راہبانہ زندگی کی تعلیم دیتا ہے اور اس مسلک میں وہ بدھ مت سے قریب تر ہے۔ جہاں انسان کو ترک دنیا کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شوپنہاور نے اپنے فلسفیانہ نظام میں کانٹ کی "شے فی نفسہٖ" (THING-IN-ITSELF) کو ارادہ سے تعبیر کیا اور اس ارادہ کی توجیہ کے ساتھ اس قنوطیت کی بنیاد رکھی جس کے لئے وہ مشہور ہے۔ اس کے نزدیک ارادہ وہ عمل ہے جو خود اپنا مقصد ہے اور عالم اس ارادہ کے اظہار یا تعین کا نام ہے۔ چونکہ ارادہ محرومی و فقدان کے احساس کا دوسرا رخ ہے اس لئے لذت اور اذیت میں تقدم اذیت کو حاصل ہے۔ لذت کی حیثیت محض ثانوی ہے انسان ان آلام سے جو ارادہ کے باعث اس پر نازل ہوتے ہیں صرف اس وقت نجات پا سکتا ہے جب وہ ارادہ کی نفی کرے۔ وہ لکھتا ہے:-

"زندگی ایک سمندر ہے جو چٹانوں اور گردابوں سے بھرا پڑا ہے انسان انتہائی احتیاط کے ساتھ ان سے کترانے کی کوشش

قابلیت سے اس کو عبور کرنے میں کامیاب ہو بھی گیا تب بھی اس
کوشش میں ہر ہر قدم پر وہ سب سے بڑی مکمل۔ ناگزیر۔ ناقابل
مداوا بربادی کی طرف جا رہا ہے جو موت سے تعبیر کی جاتی ہے بلکہ
وہ خود ہی اپنی کشتی کو سیدھا موت کے منھ میں جھونکے دے رہا
ہے۔ یہ ہے اس کی محنت سفر کی آخری منزل۔ اس کے لئے یہ
راستہ ان تمام چٹانوں سے زیادہ بدتر ہے جن سے وہ بچ کر آیا ہے"
(شوپنہاور کا مشہور شاگرد ہارٹمن) اس سے پورا اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ
"انسانی زندگی میں مسرت و شادمانی کے ذخیرے سے زیادہ غم دالم کا
ذخیرہ ہے"

ایک اور فلسفی پیٹرک PATRI CK بھی غم کی حمایت میں کہتا ہے کہ
ہزاروں لذتیں ایک الم کے برابر کب ہو سکتی ہیں۔ اسی چیز کو فانی دوسرے
انداز سے کہتے ہیں :-

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

زندگی در حقیقت نام ہے موت سے پہلو بچا بچا کر بھاگتے رہنے کا۔ ہماری ہر
سانس موت کے خلاف ایک جنگ ہے۔ وہ موت جو ہر لمحہ زندگی کے سر
پر منڈلا رہی ہے۔ بے وقوف انسان سمجھتا ہے کہ وہ اس طرح موت سے بچ کر
نکل جائے گا۔ حالانکہ موت کی حیثیت یقینی ہے۔ جس گھڑی انسان پیدا ہوتا
ہے اس گھڑی وہ موت کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔ البتہ موت اپنے شکار کے
ساتھ کچھ دیر کھیلتی ہے اس کو ہاتھ پاؤں مارنے کے لئے پوری ڈھیل دے
دیتی ہے اس کو زندگی کہتے ہیں۔

فکر پر نظر ڈالئے تو یہاں کے فلسفہ کا مزاج خاص طور سے غم میں رچا ہوا نظر
آئے گا۔ ہندوستان کے تقریباً تمام نظامہائے فکر اس بات پر متفق ہیں کہ زندگی
میں نہ صرف غم والم کی فراوانی ہے بلکہ یہ کہ زندگی کی بنیاد ہی غم پر ہے۔ انسان
کا نصب العین نجات یا نروان، اس غم سے مکمل آزادی کا نام ہے۔ صرف
چارواک CHARVAK فلسفی یا ہندی مادئین اس عقیدہ میں مستثنیٰ نظر
آتے ہیں۔ لیکن یہ استثنا بھی ہمارے نظریہ کی تائید کرتا ہے۔ یہ مادئین درد
دالم کے وجود کے منکر نہیں بلکہ عقیدہ نروان کے مخالف ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے
کہ زندگی میں غم سے مکمل رہائی ممکن نہیں۔ مسرت بغیر غم کے ایسا خواب ہے جو
کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ بہرحال حدیث غم کی ترجمانی ہندوستانی فلسفہ کا
طغرائے امتیاز رہا ہے۔ لیکن اس امتیاز میں بھی جو سب سے منفرد ہے وہ
فلسفہ بدھ ہے۔ گوتم بدھ اپنے فلسفہ کی بنیاد جن چار با عظمت صداقتوں پر
رکھتے ہیں ان میں سے ایک غم ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کی اصل غم میں
مضمر ہے۔ ہماری خواہشات اور زندگی سے لگاؤ ہی غم کے محرک ہیں۔ مسرت
بھی غم کا ایک پردہ ہے۔ مسرتوں کا عارضی ہونا، ان کی محرومی پر غم کا احساس،
ان کے کھوئے جانے کا خطرہ اور ان کے دوسرے الم ناک نتائج ہمارے
خوف اور پریشانی میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں۔ اسی طرح ویدانت فلسفہ
کے مطابق زندگی ایک فریب یا مایا ہے۔ ہستی مطلق یا برہما سے الگ اس کا
کوئی وجود نہیں۔ انسان اپنی جہالت سے اپنے آپ کو ایک مستقل ہستی
خیال کرتا ہے اور خواہشات کے پھندے میں پھنس کر اپنے کرموں کے نتیجہ
کے طور پر اس مایا جال میں مبتلا ہوتا ہے۔ نروان مایا کے فریب سے رہا ہونے

ایک شعور محض یا بے خواب نیند کی سی ہے جس میں خلش یا کسی درد کی آمیزش نہیں۔ لیکن جب تک شعور حیات اور زندگی سے لگاؤ باقی ہے۔ درد و غم کی خلش سے رہائی ممکن نہیں۔ ایران قدیم کا فلسفہ بھی زندگی کے تاریک پہلو کو تسلیم کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ زرتشت اور اس کے متبعین (زندیق اور منع فلسفیوں کا گروہ نیز مانی و مزدک) بدی اور درد و غم کی تشریح کے لئے کائنات میں ایک ظلمت یا اہرمن کا وجود تلاش کرنے پر مائل نظر آتے ہیں۔

عیسائی اور مسلمان متصوفین بھی غم کی گہرائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ تصوف اور غم میں ایک گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تصوف نے اپنی ارتقا میں جن فلسفیوں کا براہ راست یا درپردہ اثر قبول کیا ان کے خمیر میں غم پوشیدہ تھا۔ مثلاً نوفلاطونیت۔ فلسفہ ویدانت۔ فلسفہ بدھ وغیرہ۔ اس کے علاوہ تصوف کی بنا ہی ایسے وجود مطلق کے تصور پر ہے جو تمام مظاہر کی اصل ہے۔ اس اصل سے واصل ہونا ہی صوفی کی سب سے بڑی تمنا اور اس سے جدائی اس کی سب سے بڑی مصیبت ہے چوں کہ یہ مظاہر کی دنیا ہی احساس جدائی کا باعث ہے اس لئے اس کی حیثیت ایک رنج و محن کے قید خانے کی سی ہے جو روح کو اس کی اصل اور اس کے محبوب حقیقی سے جدا کئے ہوئے ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　وز جدائی ہا شکایت می کند

اس بحث سے ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ فلسفہ غم ہی تنہا فلسفہ ہے جس کی ہر فلسفی نے پاسداری کی ہے یا یہی صحیح فلسفہ ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ غم میں کوئی توانا پہلو ہے جس نے بار بار ہر ملک اور ہر زمانے کے بڑے فلسفیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔

انگریزی شاعروں میں شکسپیر (SHAKESPEARE) ان لوگوں میں سے نہیں ہے جنھوں نے فلسفہ غم کی تبلیغ کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہو تاہم اسکے چار شاہکار ڈرامے KINGLEAR, MACBETH, HAMLET اور OTHELO) میں زندگی کا ایک ٹریجک نظارہ ملتا ہے۔ مایوسی اور ناکامی کے مضامین کو شاعر نے ان چار ڈراموں میں جس قدرت اور کمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی بحث میں شکسپیر کے ٹریجک تصورات کو جگہ دیں۔ احساس و فکر کے جو نتائج شکسپیر کے ان ڈراموں میں موجود ہیں بجائے خود اہم ہیں۔ اور اہل غم کے نظریات کی تاریخ میں ایک ممتاز جگہ پانے کا حق رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں میں شاعر کا تاثر ہیرو کی شخصیت اور کہانی کے انجام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہیرو کی شخصیت کے بنیادی اجزا وہی ہیں جن سے ارسطو نے بحث کی تھی۔ اور جن پر اس معلم اول سے متاثر ہو کر متاخرین ایمان لے آئے تھے۔ شکسپیر کی عظمت کا راز اس رومانی طرز نظر میں پوشیدہ ہے جو ارسطو کے یہاں مفقود ہے۔ رومانٹک طرز نظر کی کوئی اٹل منطقی تعریف تو مشکل ہے البتہ یہ محسوس کرنا چنداں مشکل نہ ہوگا کہ رومانٹک شاعر انسانیت کے اسرار کو زیادہ اچھی طرح سمجھتا ہے۔ چناں چہ شکسپیر بھی آدمی شناسی کی بدولت اس مقام پر فائز ہے۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے۔ لیکن شکسپیئر کے ٹریجک تصور کی وسعت اور دوررسی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ انسان جو کائنات میں اشرفیت کا مرتبہ رکھتا ہے اسی کائنات کے قوانین میں پھنس جاتا ہے اور محرومی و ناکامی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ ناکامیاں ہی دراصل اس کے ڈراموں کی جان ہیں۔ ناقدین کا خیال ہے کہ اس نے ڈرامے اس وقت لکھے جب

حالات زندگی نے دنیا کو اس کی نظر میں تنگ و تاریک بنا دیا تھا۔ اس کے یہ ڈرامے اس وقت کی تخلیق ہیں جب خود اس کا دل درد آشنا ہو چکا تھا اور یہی اس کی شہرت کا راز ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم نام لکریشس LUCRECIPUS (۹۴۔ ۹۵ ق۔ م) کا سامنے آتا ہے۔ اس نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "حقیقت اشیا" میں فلسفہ ابیقوریت کو پیش کیا ہے اور اپنے عہد کی سائنس اور فلسفہ کے دقیق مسائل کو شاعری کی زبان میں ادا کیا ہے۔ لکریشس "نظریۂ سالمات" کا قائل ہے اور عالم کے مظاہر میں کسی عقلی یا ارادی نظام کو تسلیم نہیں کرتا۔ جہاں تک تشائم اور اہل تشائم سے تعلق کا سوال ہے لکریشس کی نظم کو اہمیت اس لئے حاصل ہے کہ اس میں کائنات کے حسن و جمال کے شاعرانہ احساس کے ساتھ وجود عالم کے بے مقصد اور مجبور حوادث ہونے کا ایسا فلسفیانہ عقیدہ بھی شامل ہے جو انسان کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور اپنے مرشد ابیقورس (EPICURUS) کی صحیح اسپرٹ کو لکریشس "مرگ گزند آلود" کی ستائش کرتا ہے اس لئے کہ اس سے مفر نہیں۔

اس سلسلہ میں ٹامس ہارڈی کا نام ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ جرمنی کے فلسفی شوپنہار سے کافی متاثر تھا اس کے ناولوں میں انسان اور فطرت کے باہمی تعلقات کا جو تصور ملتا ہے وہ الیت اور تشائم سے لبریز ہے۔ اس کے ناولوں میں جو افراد پیش کئے گئے ہیں وہ ماحول کے محکوم اور مجبور ہیں ہارڈی اپنی تحریر کو کمال تاثیر و معنویت سے آراستہ کر لیتا ہے جب وہ دکھاتا ہے کہ کس طرح انسانوں کے منصوبے بے رحم اتفاقات کی بدولت خود انسانی سیرت کے مخفی لیکن اٹل موروثی خصوصیات کی کارگذاری سے خاک میں مل جاتے ہیں۔ جس قدر کامیابی کے ساتھ مصنف کہانی کے ستم رسیدہ افراد کی ہمدردی کے لئے

استحقاق ثابت کرتا ہے۔ اسی نسبت سے بڑھنے والے انسانی حوصلوں کے زوال شکست پر تاسف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ شوپنہاور کا دریافت کیا ہوا ارادہ ہارڈی کے ناولوں میں ایک طاقت کی شکل میں نظر آتا ہے اور یہ طاقت بے پناہ اٹل اور اندھی ہے۔ اس کو انسان کے حسین خوابوں اور رنگین امیدوں سے بیر ہے وہی لمحہ ہارڈی کے ہیرو یا ہیروئن سے مقدر کے برگشتہ ہو جانے کا لمحہ ہوتا ہے جب ان کے دیرینہ مقاصد اور تمناؤں کی تکمیل قریب نظر آتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں ہارڈی اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ ایرانی شعرا کے ذخیرہ کلام پر نظر ڈالئے تو وہاں بھی یہی حقیقت کارفرما نظر آئے گی۔ وہاں یورپ کے مکاتب فلسفہ کا بعینہٖ عکس تو نظر نہیں آتا، تاہم ایرانی شعرا کے یہاں بھی فلسفۂ غم کی تفسیریں نمایاں ہیں۔ ایرانی شعرا کو قطعی طور پر رجائیت یا قنوطیت کے الگ الگ خانوں میں تو نہیں بانٹا جاسکتا البتہ فارسی شاعری کا شاہکار ذخیرہ وہی ہے جو حقیقت غم کی ترجمانی کرتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی۔ زندگی کی ناپائیداری عیش و عشرت کی گریز پائی۔ آسمان کی شکایت سیہ بختی اور تیرہ روزگاری کا رونا وغیرہ کتاب الم کی تفسیریں نہیں تو کیا ہیں؟ اس موقع پر اہمیت غم کے متعلق پروفیسر مسعود حسن رضوی کا اقتباس بے محل نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں:

”اک رہا غم تو وہ خوشی سے کہیں بہتر موضوع ہے اس لئے کہ خوشی انسان کے پست جذبات کو متحرک کرتی ہے اور غم بلند ترین حسیات کو بیدار کرتا ہے۔ طربیہ کے مقابلہ میں المیہ کی فضیلت کا یہی راز ہے۔“

ممکن ہے کوئی معترض کہے کہ ایک فلسفی کے لئے غم کا وجود ناگزیر ہے۔ لیکن ادیب یا شاعر کو کیا حق ہے کہ وہ اپنے اندوہ گیں نغموں سے ہمارے لمحات کو منغص کرے۔ اس اعتراض کا جواب بہت آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔ اوّل تو آرٹ اور شاعری کا تعلق ہماری زندگی سے ہے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زندگی میں غم کا حصّہ خوشی سے زیادہ ہے۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غم کے نغمے خوشی کے ترانوں سے زیادہ زندگی کے ترجمان ہیں غم کی دست سے قطع نظر اگر ایک شخص کے تجربات زندگی اس کو غم ہی سے روشناس کرتے ہیں تو اس سے ہم عیش کے قہقہوں کی توقع کیوں کریں اس کے علاوہ ایک عجیب بات ہے کہ آرٹ میں غم سے جو دلکشی و رعنائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ عیش و مسرت سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو اپنے نظریۂ آرٹ میں ٹریجڈی کو کامیڈی پر فضیلت دیتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک ٹریجڈی کی دلکشی کا راز یہ ہے کہ وہ ہمارے گھٹے ہوئے جذبات، غموں اور مایوسیوں کو نکاس کا موقع فراہم کرتی ہے اور روحانی تزکیہ کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مرثیوں میں قصیدوں سے زیادہ تاثر پایا جاتا ہے۔ نیز آرٹ بالخصوص شاعری کا جو تعلق جذبۂ محبت سے ہے وہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور محبت و غم لازم و ملزوم ہیں۔

نازپروردِ تنعم نہ برد راہ بدوست عاشقی پیشۂ رندانِ بلاکش باشد

یہی وجہ ہے کہ محبت کی چوٹ یا غم سے متاثر ہو کر شعرا نے اپنے شیریں ترین نغمے سنائے ہیں اور اپنے خونِ جگر سے بہترین معجزہائے ہنر کی تخلیق کی ہے اس حقیقت کو شیلی یوں بیان کرتا ہے:۔

"ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جو سب سے الم ناک خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہماری سب سے پرخلوص ہنسی میں بھی درد مضمر ہوتا ہے"

بقول پروفیسر مسعود حسن رضوی:-

"یہ ایک تعجب انگیز حقیقت ہے کہ ہم غم سے بچنا چاہتے ہیں مگر داستانِ غم کو بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں"۔

اگر مختلف زبانوں کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کی فہرست تیار کیجئے تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ ان میں سے اکثر کے یہاں اپنے طور پر غم ہی کی ترجمانی ملتی ہے۔ حافظ کی سرمستی میں بھی ایک گہری غم کی لہر جاری و ساری نظر آتی ہے:-

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را | کہ سر بکوہ بیاباں تو دادۂ مارا
در کوئے نیک نامی مارا گذر ندادند | گر تو نمی پسندی تغیر دہ قضا را

خیام کے متعلق اکثر کو غلط فہمی ہے کہ وہ مادیت اور فلسفہ اپیقوریت کا قائل ہے اس لئے اس کی شاعری میں عیش و مسرت کے نغمات ہوں گے۔ لیکن اس کی حکیمانہ نظر اس سطحیت کی مرتکب نہیں۔ وہ مئے و مستی کی تلقین ضرور کرتا ہے لیکن عقیدہ جبریت اور اس سے پیدا ہونے والی قنوطیت سے فرار کے طور پر وہ کہتا ہے:-

برخیز و بیا بتا برائے دل ما | حل کن بہ جمال خویشتن مشکل ما
یک کوزۂ مے بیار تا نوش کنم | زاں پیش کہ کوزہ ہا کنند از گل ما

یا ایک اور جگہ اس یقین کو دہراتے ہیں کہ زندگی 'یک نفس' سے زیادہ نہیں ہے۔

از منزل کفر تا بہ دیں یک نفس است | وز عالم شک تا بہ یقیں یک نفس است
ایں یک نفس عزیزاں خوش می دار | چوں حاصل عمر ما ہمیں یک نفس است

اس قسم کے خیالات عمر خیام کے یہاں بکثرت ملیں گے۔ فارسی شعرا کے یہاں

غم و الم ایک مسلّم اور ناقابل تردید حقیقت ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ اس حقیقت سے گریز کرنے کے واسطے مطرب و جام کا سہارا لیتے ہیں لیکن فلسفہ کی تہ میں یہی غم کارفرما ہے۔ حافظ کا شعر ہے۔

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد — من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ غم کے متعلق اہلِ مغرب کا رویہ ایرانی نظریہ سے بہت قریب ہے۔ مغربی شاعر رومانی فضا میں غم و الم حیات سے پناہ ڈھونڈھتا ہے اور ایرانی شاعر تلخیٔ غم سے بچنے کے لئے مطرب و جام و مینا کے سہارے تلاش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی اور ایرانی شاعری میں غم و الم کی ایک چھپی ہوئی لہر تو پائی جاتی ہے مگر غم کو گلے لگانے کا سلیقہ یا زہر غم میں ڈوبے ہوئے میر و فانی کے سے نشتر معدوم ہیں۔ یاسیات کا عنصر ہماری اردو شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور خصوصیت کے ساتھ میر اور فانی کی نشتریت سے کوئی ناواقف نہیں۔ اس اعتبار سے اردو شاعری کی حیثیت منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے کہ یاسیت اپنے اصلی نکھار کے ساتھ کارفرما ہے یہی وجہ ہے کہ جو اثر اردو المیہ شاعری میں ہے اور کسی شاعری میں نہیں ہے۔ اردو شاعری میں سودا پر میر کو۔ انشا پر مصحفی کو۔ ناسخ پر آتش کو اور ذوق پر غالب کو جو برتری حاصل ہے اس کا راز بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ انشاء اللہ خاں جب اپنی پھکڑ پتی اور ہنسوڑ پن چھوڑ کر لذتِ غم سے واقف ہوتے ہیں جب ہی ان کی شاعری میں وہ اثر پیدا ہوتا ہے جہاں جیسے ان کی غزل "نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری" سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ میر مصحفی، آتش، غالب اور فانی وغیرہ کے یہاں تو غم کے نغمے ان کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اقبال جن کو ایک پیامی شاعر اور شاعرِ فردا کہا جاتا ہے ان کا دامن بھی غم کی گلکاری سے مزیّن نظر آتا ہے۔ حقیقت میں اعلا نصب العین رکھنے والا جذبات کی سطحیت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ نصب العین کی جتنی تڑپ اس کے دل میں ہوگی اتنی ہی وہ موجودہ حالات سے بیزار اور غیر مطمئن نظر آئے گا یہ اور بات ہے

کہ اس کا غم تشخصی ہونے کے بجائے ملّی یا اجتماعی ہو۔ ابتدائی شاعری میں ان کا غم کچھ چھپا اور دبا ہوا سا ہے لیکن آخر میں ضبط کا بند ٹوٹتا ہے اور غم کا لہجہ ان کی تمام شاعری پر چھا جاتا ہے۔ ارمغانِ حجاز اور مثنوی پس چہ باید کرد۔ ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں۔ آخر الذکر تصنیف میں اقبال اپنے متعلق یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

بندۂ چوں لالہ داغ در جگر	دوستانش از غم او بے خبر
بندۂ اندر جہاں نالاں چو نے	تغتہ جاں از نغمہ ہائے بے بے
در بیاباں مثلِ چوبِ نیم سوز	کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز
جاں ز مہجوری بنالد در بدن	نالۂ من وائے من اے وائے من

اقبال اپنی بالکل ابتدائی شاعری داغ اور دوسرے شعرا کے زیرِ اثر رسمی انداز میں شروع کرتے ہیں۔ لیکن بہت جلد ان کا غم آشنا دل قومی درد سے متاثر ہو کر آنسو بہانے لگتا ہے۔ نالۂ یتیم، صیقلہ (جزیرۂ سسلی) نوائے غم۔ عبد اللہ ے درد وغیرہ اس دور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پھر جب ان کی نظر زیادہ سنجیدہ ہوتی ہے تو ان کا فلسفیانہ تجسس ان کو رازِ حقیقت کی جستجو میں بے چین کرتا ہے تو یہ کرب و اضطراب ان کی شاعری میں بھی نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔ "شمع و شاعر"۔ رات اور شاعر۔ والدہ مرحومہ کی یاد میں۔ حقیقتِ حسن۔ ہمارے دعوے کے ثبوت میں کافی ہیں۔

آہ یہ دنیا۔ یہ ماتم خانۂ برنا و پیر	آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت	گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آہ غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے	نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے

جنتِ نظارہ ہر نقش ہوا بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اسکو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بیدردی سے نقش آساں مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اسکے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

یہاں تک کہ وہ اپنے فلسفیانہ سفر کی منزل تک پہونچ جاتے ہیں یہاں ان کو زندگی اور حقائق کائنات کے راز منکشف ہوتے ہیں۔ اب ان کی تڑپ اور دردمندی ایک دوسرے انداز میں ظاہر ہوتا ہے۔ نصب العین پر پورا ایمان اور یقین ان کے دل میں تڑپ اور دردمندی کا اضافہ کر دیتی ہے۔ انھیں اس بات تاسف و حسرت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا آفتاب غروب ہونے کے قریب آگیا اور وہ اپنی جد و جہد اور عملی صلاحیتوں کو اس نصب العین کے حصول کی راہ میں صرف نہ کر سکے۔ نیز انھیں اس بات کا بھی غم ہے کہ ان کی قوم ابھی خواب غفلت ہی میں آسودہ ہے اور اس کے نوجوان اس غم اور جذبہ سے نا آشنا ہیں جو خود اقبال کو شب و روز بے چین رکھتا ہے۔

جوش کی شاعری عام طور پر محض وقتی مسرت اور لذت پرستی کی شاعری سمجھی جاتی ہے۔ جہاں کہیں وہ ناصح یا واعظ کا جامہ اختیار کرتے ہیں تو ان کو زیب نہیں دیتا اور ان کا لہجہ نامانوس معلوم ہونے لگتا ہے۔ لیکن ان کی شاعری بھی ان ہی لمحوں میں فن کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتی ہے جن میں وہ غم کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "فریب ہستی" کو لیجئے۔ جوش کی عام نظموں کے برخلاف جس کا اثر وقتی اور سطحی ہوتا ہے اس نظم کو جتنی بار پڑھیے اس کی خوبی اور کشش بڑھتی جاتی ہے۔ یہ اسی سنجیدہ غم کی کیفیت کا اثر ہے جس سے یہ نظم بھرپور ہے۔

اس کے علاوہ ان کے یہ اشعار پڑھیے آپ کو جو بے چین اور بے قرار

وہ رح نظر آئے گی اس کا اثر بھرپور اور مزاج شعری کی بلندی نظر آئے گی۔

ہر سانس میں قانون سزا جاری ہے — ہستی نہیں اک قسم کی بیماری ہے
انسان پہ یہ زندگی ہے اک قہر خدا — بیمار پہ یہ رات بہت بھاری ہے

ہر بات میں تیغ خوں چکاں ہے یارب — ہر پاؤں میں زنجیر گراں ہے یارب
مذہب کی برادری سے دل تنگ ہوا میں — انسان کی برادری کہاں ہے یارب

جدید ترقی پسند شعرا جو اصولی طور پر قنوطیت کی دشمن ہیں۔ وہ بھی جذبات غم سے اپنی شاعری کو نہیں بچا سکے۔ فیض۔ جذبی۔ مجاز اور سردار کا طبعی میلان اسی طرف ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی حقیقی شاعر مقصود موجود کی کشاکش یا ماحول کی تلخیوں سے بے نیاز اور بے حس نہیں رہ سکتا۔ دور حاضر کی شاعری میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے یہاں واردات حسن و عشق کے ساتھ دوسرے اہم سماجی اور معاشرتی حالات بھی ملتے ہیں۔ ان کا غم ذات کا بھی ہے اور کائنات کا بھی۔ کبھی سماج کی اس ناآسودگی کی بنا پر اور کبھی سیاست کے انتشار کے نتیجہ پر غم کا اظہار ہو گا۔ یہاں غم کا دائرہ وسیع بھی ہے اور انوکھا بھی۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذات، کائنات۔ سیاست اور سماج یہ سب ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے ہیں اور کسی کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہاں ہم صرف چند اشاروں پر اکتفا کریں گے۔

فیض کو اپنے دیس اور اس کے رہنے والوں کی خستہ حالی۔ قوم کی عزت و ناموس کی رسوائی۔ جہالت۔ بھوک کا احساس شدید ہے اس کا نصب العین اجتماعی ہے مگر وہ اس اجتماعی جذبات کو شخصی غم میں دکھاتا ہے

بُجھا جو روزنِ زنداں تو دل نے یہ سمجھا
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کوچۂ یار سے بے نیلِ مرام آتا ہے
ہر کوئی شہر میں پھرتا ہو سلامت دامن
رند میخانے سے شائستہ خرام آتا ہے

فیض کے یہاں لہجے کی درد ناکی اور فضا کی نرمی ایک خاص چیز ہے اس میں رومانیت نے ایک ایسی کسک پیدا کر دی ہے جو عاشق کا مزاج بن جاتی ہے

تمہارے ہاتھ پہ ہو تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہو دلداریٔ عروسِ سخن
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہو فلک
تمہارا دم ہے تو دم ساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام
سلام لکھتا ہو شاعر تمہارے حسن کے نام

موجودہ دور کے یاس پسندوں میں سب سے اہم نام جذبی کا آتا ہے ان کی یاسیت تغزل کی وجہ سے رومانی یاسیت بن گئی ہے۔ حسن و عشق کی واردات میں غم کی لے نمایاں ہے ان کے یہاں عیش وصال بھی آنے والے ہجر میں سوگوار نظر آتا ہے۔

جب کبھی کسی گل پر اک ذرا نکھار آیا
کم نگاہ یہ سمجھے موسم بہار آیا

ان پر فانی کے رنگ کا اثر نمایاں ہے گو فانی کے فلسفہ اور تصوف سے ان کا مذاق بیگانہ ہے۔ جذبی کے یہاں بھی زندگی اور موت کی کش مکش نظر آتی ہے اور اس کش مکش میں وہ موت کے طلبگار نظر آتے ہیں

ہم نے غم کے ماروں کی محفلیں بھی دیکھی ہیں — ایک غم گسار اُٹھا۔ ایک غم گسار آیا
دل تو سینکڑوں غم سہتے پر غم جہاں جذبی — بعد ایک مدت کے دل کو سازگار آیا

وہی جفائیں، وہی سختیاں، وہی آفات — تمھیں بتاؤ کہ بدلے کہاں مرے دن رات

عذاب درد پہ نازاں ہیں اہلِ درد مگر — نشاطِ درد میسر نہیں تو کچھ بھی نہیں

جذبی شخصی غم میں مبتلا ہیں مگر اجتماعی احساس سے بیگانہ نہیں۔ یہی سبب ہے کہ شخصی غم میں اجتماعی غم کی آمیزش بھی ہے۔ دوسروں کے مقابلہ میں جذبی کے یہاں غم کے نشتر زیادہ تیز ہیں۔

مجاز کی طبیعت باغیانہ ہے۔ مذہب، سیاست، سماج، الغرض ہر چیز سے بغاوت کے اثرات اس کے یہاں نمایاں ہیں۔ یہ بغاوت دراصل اس ناآسودگی سے پیدا ہوئی ہے۔ محبت کی ناکامیوں اور زندگی کی تلخیوں نے مجاز کو ہر چیز سے باغی بنا دیا۔ سماج کا باغی اس لئے ہے کہ سماج نے اس کی خواہشات کا احترام نہیں کیا۔ سیاست سے اس لئے متنفر ہے کہ جس نئے نظام کا خواب اس نے دیکھا تھا اس کی تعبیر یہ نہیں ہے۔ مذہب سے بیزاری اس لئے ہے کہ اس کے دعوے داروں کا روپ بڑا مکروہ اور بھیانک ہے غرض اس بے قراری اور بے چینی نے اس کو ایسے سمندر میں پھینک دیا جہاں تلخیوں اور مصائب کے تھپیڑے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے لہجہ میں تلخی پیدا ہو گئی۔

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں

ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں۔ اے وحشتِ دل کیا کروں

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

مجاز کی طرح سردار جعفری بھی باغی ذہن رکھنے والوں میں ہے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ مجاز کی رومانیت نے اس تلخی کو مدھم بنا دیا ہے۔ مگر سردار کی یلغار اس رومانیت سے محروم ہے۔ زندگی کی آسودگیوں نے سردار کے باغیانہ فکر کو مصلحت اندیشی بھی بخش دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں اگرچہ غم کی وہ شدت اور المیہ کی وہ تیزی نہیں ہے جو مجاز کے یہاں ہے۔ اور نہ غزل کا وہ دھیما پن اور سوزو گداز ہے جس نے جذبی کی لے کو تند اور تیز بنا دیا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بھی زندگی کی ان بدلتی ہوئی قدروں سے مطمئن نہیں۔ اس بے اطمینانی کے غم کا اظہار سردار کے ان اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

یقیں کا ذکر ہی کیا ہو کہ اب گماں بھی نہیں مقامِ درد نہیں، منزلِ فغاں بھی نہیں
وہ بے بسی ہو کہ جو قابلِ بیاں بھی نہیں کوئی ترنگ ہی باقی رہی نہ کوئی اُمنگ
جبینِ شوق نہیں سنگِ آستاں بھی نہیں رقیب جیت گئے، ختم ہو چکی ہے جنگ
دلوں میں شعلۂ غم بجھ گیا ہے کیا کیجئے کوئی حسین نہیں کس سے اب وفا کیجئے
سوائے اس کے کہ قاتل ہی کو دُعا دیجئے

زندگی کا ڈرامہ اگر تمام تر المیہ نہیں تو کم از کم غم و الم اس کے اہم اور غالب اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک عظیم شاعر یا ادیب جتنا زیادہ حساس ہوگا اتنا ہی غم کا ترجمان ہوگا۔ مختصر یہ کہ غم نہ صرف زندگی کا ایک ناقابلِ تردید پہلو ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔

راز کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

دل ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں
دوستوں کی مہربانی چاہیئے

فانی کا غم اور عشق

جب ایک شاعر کو پے بہ پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کی ہر اُمید مایوسی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب اس کی زندگی موت بن جاتی ہے اور وہ ہر مسرت سے کنارہ اختیار کر لیتا ہے اس کی قوت عمل شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ زندگی سے فرار اختیار کرتا ہے۔ یہ فرار اپنی ہیئت بدل کر متعدد شکلوں میں نمودار ہوتا ہے مثلاً:۔

۱۔ ریختی : ——— جس میں جسمانی لذتوں کا ذکر مزے لے لے کر کیا جاتا ہے۔ اس کا مطمح نظر جنسیات سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ شاعر اپنے غم کو یا ماحول کے غم کو ان لذتوں کی یاد میں فراموش کر دینا چاہتا ہے۔ وہ محبوب کے بو، رنگ اور لمس سے حظ اُٹھاتا ہے مگر یہ شاعری کی ادنا مثال ہے کبھی کبھی یہ فرار ہزل اور فحش گوئی کی طرف بھی مائل کرتا ہے۔

۲۔ ہجو : ——— اس میں وہ اپنے غم کا مداوا دوسروں کے مضحکہ اُڑانے سے کرتا ہے۔ دوسروں کی خامیوں پر قہقہہ لگانا اور ان سے لطف اندوز ہونا۔ ان کے زخموں کو کرید کرید کر اپنی لذت کا اہتمام کرنا اور ان کی کمزوریوں سے بے جا فائدہ اُٹھانا یہ سب زندگی کے فرار کی کے واسطے پناہ گاہیں تھیں اور اس میں کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر دوسروں کے گریبان پر بس نہیں چلتا تو پھر اپنے گریبان پر تو اختیار ہے۔

۳۔ تصوف : ——— صحیح تصوف جو پختگیٔ اعتقاد اور حسنِ عمل سے عبارت

ہے۔ اس سے یہاں محبت نہیں بلکہ تصوف کا وہ مفہوم مراد ہے جس نے ہر چیز کو تقدیر پرستی کا تابع بنا دیا۔ عمل اور ولولوں کو دبا کر زندگی کو جبر اور محکومیت کا لباس پہنا دیا۔ اس سے یہ ضرور ہوا کہ شاعری میں سنجیدگی پیدا ہو گئی مگر سعی وعمل کے جذبات سلب ہو گئے۔ وہ لاامی پُرپیچ وادیوں میں اس طرح کھو گیا کہ الاامی طرف ذہن کی رسائی کی راہ مسدود ہو گئی۔

وہ لوگ جنھوں نے ریختی کو اپنی پناہ کا ذریعہ بنایا اور جسمانی لذتوں میں اپنے کو فراموش کر دیا، رنگین اور انشا ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے دوسروں کی کمزوریوں پر قہقہے لگائے اور ان کی تکلیف پر مسرت کا اظہار کیا سودا اور ضاحک ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے تصوف کو اپنایا اور تقدیر پرستی پر قانع ہو گئے، میر اور درد ہیں۔ مگر فانی کی ذات ان سب سے الگ ہے اس نے تصوف کو ضرور اپنانے کی کوشش کی مگر مسلک گوسفندی کو کبھی اختیار نہیں کیا۔ اس کا غم ریختی اور ہجو دونوں کے سہارے سے بے نیاز ہے۔ غم پرست عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اول تو وہ لوگ ہیں جن کا ذہن مستقل طور سے غم کی آماجگاہ نہیں۔ جب حالات زمانہ کے زیر اثر ان لوگوں پر غم کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ان کے افعال اور اعمال سے اضطراری کیفیت اور ربودگی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اس دور سے گذر جاتے ہیں تو خوشی اور مسرت کا غلبہ بھی اسی طرح ہوتا ہے کہ خود فراموشی کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے لوگوں میں انگریزی ادب میں شیلی کا نام قابل ذکر ہے۔ ایک وقت میں اس کو ہر شے پر مسرت اور شادمانی چھائی ہوئی نظر آتی ہے اور اس خوشی و کیف کے عالم میں یہ فراموش کر دیتا ہے کہ یہ مسرت عارضی بھی ہو سکتی ہے دوسرے لمحہ جب اس پر غم و الم کا غلبہ ہوتا ہے تو وہی ہر شے جو روشن تھی تیرہ.

نظر آتی ہے۔ اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ اس ناامیدی میں اُمید کی کرن بھی نمودار ہو سکتی ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اپنی غم پرستی کے اظہار میں تفاخر سے کام لیتے ہیں۔ خوشی اور اس کے مظاہر پر حقارت کی نظر ڈالتے ہیں۔ ان لوگوں کی ذہنیت سطحی اور اوچھی ہوتی ہے اور ان کی پسند و ناپسند میں نظر کی گہرائی کے بدلے خودنمائی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ مسلک ان لوگوں کا ہے جو عنفوان شباب میں تشائم کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔ ہمارے نئے ادیبوں اور شاعروں میں ایسی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ تیسرے ان لوگوں کا نمبر آتا جو غم کو عین حقیقت قرار دیتے ہیں اور مسرت کے وجود کو معتبر نہیں سمجھتے۔ اس مسلک کو اختیار کرنے کے لئے فلسفیانہ ژرف نگاہی کی ضرورت ہے۔ اردو میں جن لوگوں نے اس کو اختیار کرنے کی کوشش کی ان میں اکثر تصنع کا شکار ہو گئے۔ اس کے برخلاف فانی غم و مسرت دونوں کے وجود کا اقرار کرتا ہے مگر از روئے حقیقت شناسی اوّل الذکر کو آخر الذکر پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کی وجہ خود فانی کی زبان سے سنیئے :۔

غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی　　کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

ایک جگہ غم کی دوسری توجیہ بیان کی ہے ؎

"غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں"

اس بیداری کے لئے وہ غم کو اختیار کرتا ہے۔ وہ غم کو اس لئے ترجیح دیتا ہے کہ اس کے گذرنے کے بعد مسرت ہو گی مگر مسرت کے گذرنے کے بعد شاید وہ غم کا متحمل نہ ہو سکے۔ یہ فلسفہ فانی کی زندگی اور شاعری پر حاوی نظر آتا ہے۔ وہ اس سے ایک انچ ہٹنے کے واسطے تیار نہیں۔ جب وہ "غم دوراں کو غم جاناں" بنا نا جانتا ہے تو پھر اس سے فرار کیا معنی! اس لئے وہ پڑھتا ہے

اور غم کو گلے سے لگا لیتا ہے۔

فانی کے غم کے متعلق لوگ مختلف الخیال نظر آتے ہیں۔ کسی کا کہنا ہے کہ وہ تمام ازل ہی کے یہاں سے دردمند دل لے کر آیا تھا۔ کسی کا دعویٰ ہے کہ عشق کی ناکامیوں نے اس کی نوا کو فسردہ بنا دیا۔ کسی نے ماحول کی ناسازگاری کو غم کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ غم و رنج میں دوسرو ل کے گریبان پر بس نہ چلا تو اپنے ہی گلے کو گھونٹنے کا ولولہ پیدا ہو گیا۔

اگر ہم حیات انسانی کا تجزیہ کریں تو اس میں دو عنصر کارفرما نظر آئیں گے۔ غم اور مسرت۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں جیسے ایک ورق کے دو صفحے۔ ایک وقت محفل میں ماتم و شیون ہو رہا ہے دوسرے وقت ہنسی قہقہے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ غم و مسرت انسان کے سب سے ابتدائی جذبات ہیں۔ سوال صرف اس قدر پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مقدم کس کو سمجھا جائے۔ فطرت انسانی کے بڑے بڑے محققین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ رنج و الم انسانی زندگی کی ایک فطری حقیقت ہے جس سے گریز ممکن نہیں۔ اگر اس کی فلسفیانہ توجیہ کی جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ زندگی حرکت اور تڑپ کا نام ہے۔ برگساں اس کا قائل ہے کہ "کائنات ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے"۔ حرکت صرف تاریکی سے روشنی میں آنے کا نام نہیں ہے بلکہ روشنی سے تاریکی میں بھی جانے کو حرکت کہتے ہیں۔ جب یہ حرکت رک جاتی ہے تو فنا کا وجود ہوتا ہے۔ فانی کہتا ہے۔

راحت کا مفہوم یہی ہے جہد طلب سے باز نہ آ　　بڑھنے دے دل کی بے چینی، تڑپے جا آرام نہ لے

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

خود برق ہو اور طور تجلا سے گذر جا — خود شعلہ بن اور وادیٔ سینا سے گذر جا

میرے جوش طلب کی شان استغنا کوئی دیکھے

کہ میں رہبر سے آگے، مجھ سے آگے ہے قدم میرا

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا — مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا

اے درد یہ چٹکیاں کہاں تک — اٹھ اور جگر کے پار ہو جا

فانی کے یہاں غم کس پہلو سے آیا، غم نے آخر وہ کون سا راستہ اختیار کیا جو اس کو فانی تک بار ملا؟ یہ سوال دل چسپ ہونے کے ساتھ پیچیدہ بھی ہے۔ غم ایک تو وہ ہے جو فلسفہ کی راہ سے آتا ہے جیسے شوپنہاور کے یہاں ہے۔ ایک وہ غم ہے جس کے ذریعہ سے انسان فلسفیانہ تفکر تک پہونچتا ہے۔ اس کی مثال ہارڈی وغیرہ ہیں۔ فانی کا غم دراصل اس کی آپ بیتی ہے جس کو وہ فلسفیانہ رنگ دیتا ہے۔ غم پر آنسو بہانا ایک فطری امر ہے۔ جب فانی کو غم سے واسطہ پڑا تو ان کے وہ اوصاف جن پر تقلید کی زنگ چھائی ہوئی تھی ایک ساتھ جلا پا گئے۔ قاضی عبدالغفار نے ایک جگہ فانی کی زبان سے غم کی شرح اس طور سے کی ہے۔

"زندگی شعر ہے۔ مگر زندگی کا ہر جذبہ اور ہر بحران شعر نہیں — صرف غم شعر ہے۔ تازہ پھول کا حسن شعر کا ایک ادنیٰ مقام ہے مگر مرجھائے ہوئے پھول کی گذری ہوئی رعنائی۔ مٹا ہوا رنگ حقیقی شعریت کا ارفع ترین مقام ہے — اس نے کہا۔ قہقہوں میں شعر اگر ہے تو بہت کم۔ البتہ اس کی ساری دنیا آنسوؤں میں ہے۔ ایک زخم میں ہے اور وہ زخم جس قدر زیادہ ناقابل علاج ہو شعر اتنا ہی زیادہ بلند اور بلیغ ہو جاتا ہے۔"

فانی کو اہلِ غم سمجھنے کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کے یہاں اُمید اور خوشی کی کرن یا تو آتی نہیں یا اگر آتی ہے تو چند لمحوں کے واسطے جن کے بعد پھر یاس و حرماں کی تاریکی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کو جب خوشی کے لمحات آکر گدگدانے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو بھی پکار اُٹھتا ہے۔

کیا جام مئے ہوش رُبا دیتا ہے — کیا مژدۂ ردِّ ہر بلا دیتا ہے
ہر قطرۂ مئے ہے خون عہد عیش بدوش — مے دے کے فریب عیش کیا دیتا ہے

وہ جانتا ہے کہ اس کو جو کچھ دیا جا رہا ہے وہ حقیقت میں "عیش" نہیں بلکہ "فریب عیش" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غم ہی کو حاصل نشاط خیال کرتا ہے۔ ایک رباعی سنیئے:-

غم عین نشاط و راز تخلیق نشاط — غم حجت انبساط و تصدیق نشاط
غم کا ہے تبسم جسے کہتے ہیں وجود — ہستی کو ہے غم کے دم سے توفیق نشاط

وہ جب کلیوں کو متبسم دیکھتا ہے تو متنبہ کرتا ہے۔

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حال انھیں معلوم نہیں[1]
کلیوں کا یہ طرز تبسم یہ شادابی کیا کہیئے

یہی غم جب آگے بڑھتا ہے تو یاس کی شکل اختیار کر لیتا ہے ان کو اپنی بدنصیبی کا کامل یقین ہے۔ وہ زندگی اور موت میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یا رب — موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیئے تھا

یاس و مایوسی کی سینکڑوں مثالیں فانی کے یہاں مل جائیں گی۔ چند ملاحظہ ہوں:-

---

[1] میر کا شعر ہے:-

یہ پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

محشر بدایونی:-

پژمردگی گل پہ ہنسی جب کوئی کلی — آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

برق کو اب کیا غرض، کیا رہ گیا کیا جل گیا
جل گیا خرمن میں جو کچھ تھا مری تقدیر کا

بہت سر پٹختی ہیں آرزوئیں
کوئی ناکام جاتا ہے جہاں سے

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکر بہار آیا، سمجھے کہ بہار آئی

یاس نے دردہی نہیں حق تو یہ ہے یہ ابھی دیا
فانی نا امید کو موت کا آسرا دیا

ایک جگہ ایذا پسندی کی حد کردی ہے۔

بچھ گئے راہ یار میں کانٹے
کس کو عذر برہنہ پائی ہے[۱]

فانی کے دردمند دل کی مثال اردو شاعری میں میر کے علاوہ کسی دوسرے شاعر میں مشکل سے ملے گی۔ میر کا غم شخصی اور سادہ ہے جو محبت کی ناکامیوں اور زندگی کی تلخیوں کے باعث فطرت انسانی سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ میر کا غیر معمولی احساس اس میں شدت پیدا کرتا ہے۔ ان کے لہجے کی نرمی اور گھلاوٹ ان کے غم کو تہذیب نفس بخشتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میر کے یہاں فلسفیانہ رجحان اور آفاقیت اسی لئے پیدا ہوئی کہ ان کے یہاں غم ہے۔ فانی کے غم میں بھی خلوص ہے۔ وہ ان کا ذاتی اور حقیقی غم ہے۔ لیکن اس پر ایک عام انسان کی طرح

---

[۱] اس خیال کو دوسرے شعرانے بھی ادا کیا ہے۔

غالب:۔ ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

اقبال: ہیں عقدہ کشا یہ خار صحرا
کم کر گلۂ برہنہ پائی

ظفر بدایونی:۔ مجھے تو چارہ گر لذت کشِ آزار رہنے دے
نکالیں خار تلوؤں کے تو نوکِ خار رہنے دے

تہور بدایونی:۔
یہ مانوس خلش اے چارہ گر تلوؤں کے چھالے ہیں
کہ پھر سے پھوٹ کر رستے ہیں جب کانٹے نکالے ہیں

اہل سخن سے یہ نکتہ پوشیدہ نہیں کہ فانی نے ایذا پسندی کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کے باوجود اس کی شعریت کو برقرار رکھا ہے۔

تڑپنے اور نالہ کرنے کی بجائے وہ اس کو اپنے فلسفیانہ فکر کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ اس کو زندگی کی ناگزیر حقیقت بلکہ "ہر کہ از دوست می رسد نکو است" خیال کر کے گلے سے لگا لیتے ہیں۔ ان کی ناکامیوں نے ان کے غم کو بنا سنوار کر ایک نئے روپ میں پیش کیا جہاں غم میں شدت تو ہے مگر تلخی نہیں، جہاں غم کو انھوں نے نئے آداب سے سنوارا۔ نئے تکلفات سے نکھارا۔ اگر ان کا غم عارضی یا سطحی ہوتا تو چند روز کے بعد ہمیشہ کے واسطے بجھ جاتا مگر "جب غم زندگی بن جائے۔ جب زندگی جاوید کی خواہش بھی عزیز نہ رہے۔ اس وقت موت سے زیادہ خوب صورت کوئی چیز نہیں۔ اس کی تاریکی روشنی پیدا کر سکتی ہے"[۵] ان کی اس آواز میں بلند آہنگی ہے مگر یہ بلند آہنگی کانوں کو ناگوار نہیں گذرتی بلکہ خوش آہنگی کے سبب اس میں سرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے درد بھرے نغمے کی سی ہے جو کسی تاریک سناٹے میں ساز پر گایا جا رہا ہے۔ جو سنتا ہے وہ اس کو اپنے ہی دکھ بھرے دل کی صدا خیال کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ فانی کا غم مریضانہ نہیں ہے۔ ان کی شاعری "کافور" "تربت" "لحد" اور "کفن" کی شاعری نہیں ہے بلکہ اس میں غم کا عرفان موجود ہے۔ یہ عرفان غم کی ہیئت بدل دیتا ہے۔ وہی مکروہ اور بھیانک موت جو مہیب معلوم ہوتی تھی فانی کے یہاں حسین ہو گئی۔

ادا سے آڑ میں خنجر کے منھ چھپائے ہوئے
وہ لائے میری قضا کو دلہن بنائے ہوئے

موت کا عنوان فانی کے یہاں کثرت سے ملے گا۔ موت کے عنوان پر متعدد شعرا نے اظہار خیال کیا ہے مگر بہ استثنائے چند متفکرانہ انداز نظر سب کے یہاں مفقود ہے۔ اس کا ذکر سطحی اور رسمی طور پر مل جائے گا۔ مگر فانی کی حیثیت اس سلسلہ میں انفرادی

۵۔ فانی بدایونی۔ فراق علی گڑھ میگزین فانی نمبر

ہے۔ انھوں نے موت کے مسئلہ پر عارفانہ نظر ڈالی ہے۔

دریوزۂ تمنا مرے مسلک میں ہے حرام — دریردہ نا زندگی کا تقاضا کہیں جسے

فانیؔ سکونِ موت نے دل سے مٹا دیا — وہ نقش بے قرار کہ دُنیا کہیں جسے

موت ہی ساتھ دے تو دے فانیؔ — عمر کو عذر بے وفائی ہے

زندگی خود کیا ہے فانیؔ یہ تو کیا کہئے مگر — موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

ایسے اشعار کو مرگھٹ یا جنازے کی شاعری کہنا تنقید نہیں ہے، تنقید کے ساتھ ظلم ہے۔ بقول فراق:-

"ہم کیوں بھول جائیں کہ تاریخ انسانیت بیمار پڑ پڑ کر اپنے کو صحت یاب بناتی ہے۔ شاعر کی زندگی بسا اوقات انسانی تاریخ کے ان بحرانی وقفوں کی نشانی اور علامت ہوتی ہے جو بہ یک وقت زندگی اور موت کے امکانات کے حامل ہوتے ہیں"[1]۔

ان کے یہاں پناہ گزینی کا جذبہ نہیں ہے بلکہ وہ زہر کو زہر سمجھ کر پیتے ہیں۔ وہ اس کے بھی روادار نہیں کہ زہر میں دوا بھی ملائی جائے۔ ع

"بس اب تو زہر ہی دے، زہر میں دوا نہ ملا"

بقول سرور صاحب "فانیؔ کے یہاں غم کا عرفان ملتا ہے جو غم اور موت دونوں کو گوارا بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موت سے گریزاں نہیں ہوتے بلکہ خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں"[2]۔ وہ پناہ کی خاطر غم کو اختیار نہیں کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں کوئی جدو جہد کا پیغام نہیں ہے مگر پھر بھی ان کا غم جامد اور مضمحل نہیں بلکہ اس میں ایک تڑپ ہے۔ اس اعتبار سے وہ اقبال سے نزدیک ہیں۔

---

[1] فانیؔ از فراق گورکھپوری

راحت کا مفہوم یہی ہے جہدِ طلب سے باز نہ آ
بڑھنے دے دل کی بے چینی تڑپے جا، آرام نہ لے

دل تو دل ہے۔ دل کو چین آ جانا تو آسان نہیں
درد نہ وہ ہے جو دل میں اٹھ کر آپ بھی پھر آرام نہ لے

فانی کا یقین ہے :-

" شاعر جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے (وہ کسی ملک، کسی قوم یا کسی زمانہ کا شاعر ہو) وہ اس کا ماحول نہیں ہوا کرتا۔ جس دنیا میں اس کا ظہور ہوتا ہے وہ دنیا اس کی اپنی دنیا سے بہت پیچھے کی دنیا ہوا کرتی ہے۔ وہ زمانہ مستقبل کا انسان ہوا کرتا ہے"[۱]

اقبال مردِ مومن کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اس کی بدلی ہوئی شکل فانی کے یہاں ملتی ہے۔

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا
مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا

یہ غم ہی کا فیضان ہے کہ اس نے اقبال کو خودی بخشی اور فانی کو بے خودی۔ مگر بے خودی کے باوجود فانی کے یہاں احساسِ خودی بھی موجود ہے۔ مگر یہ احساسِ خودی فانی کی انفرادی تجربات اور ذاتی واردات کا رہینِ منت ہے۔ اقبال کی طرح کسی اجتماعی اور ملی پیغام کا حامل نہیں۔ اس لئے کہ فانی شاعری کو اصلاح و تبلیغ کے ذریعہ کے طور پر استعمال کرنے کے قایل نہیں۔

تسلیم ہیں مجھے بھی تری بے نیازیاں
یہ کیا کہوں کہ میری تمنا غیور ہے

دنیا مری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

نازم بہ تجیہ کردن خانی بہ لطف دوست
اے داغ غرور مردن و عذر زیستن

مرے شوق نے سکھایا اسے شیوۂ تغافل
نہ مجھے نیاز ہوتا، نہ وہ بے نیاز ہوتا

کبھی وہ عصمت کامل کے دعووں کو اپنے عجز گناہ کا حاصل خیال کرتے ہیں

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے، راز بلندی پستی ہے

رنج و آرام کی شدت اور امید کے راستوں کا مسدود ہو جانا، شاعر کی اذیت اور پریشانی کے لئے بہت ہے۔ اگر مسلسل ناکامیوں اور پیہم مایوسیوں سے گھبرا کر وہ فریاد کرتا ہے تو یہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ چناں چہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"جب کوئی حقیقی شاعر دنیا کے سامنے آیا۔ دنیا نے اسے کبھی نہیں پہچانا۔ اس کی زندگی میں اس کے ساتھ دو طرح کا سلوک ہوا بعض نے اسے آدمی تو سمجھا مگر ذلیل و حقیر۔ اس لئے کہ اس کا وجود دنیاوی اعتبار سے انسانی نقطۂ نظر سے بے کار تھا۔ بعض جنھوں نے اس کی بلندیٔ تخئیل اور پرواز خیال کی اپنے نزدیک بہت کچھ قدر فرمائی اسے آدمی سے بالاتر سمجھا۔ اسے کوئی فرشتہ یا کوئی مجسمۂ روح تصور فرمایا۔ ان کے نزدیک چوں کہ اس کی زندگی صرف روحانی زندگی تھی اس لئے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کو بھی اپنی زندگی انسانوں کی طرح بسر کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کو اس کا یقین ہی نہ آیا کہ وہ کھانے پینے، سونے جاگنے اور سردی سے محفوظ رہنے کے سامان سے بے نیاز نہیں ہے۔ ان کے پاس یہ باور کرنے کی کبھی کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ شاعر بھی دنیاوی تکالیف سے متاثر ہو سکتا ہے[1]"

[1] سب رس۔ حیدر آباد (شعر و شاعری)

اف کہ گنہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف
آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا

جتنے غم چاہیے نہ دے جا مجھے یارب لیکن
ہر نئے غم کے لئے تازہ جگر پیدا کر

جیسا کہ کہا گیا کہ اس قسم کے لمحات کہ جس میں فانی نے غموں سے گھبرا کر شکوہ کیا ہو بہت کم ہیں۔ فطرت انسانی کے تقاضے سے اگر آہ نکل گئی ہو تو دوسری بات ہے ورنہ عام طور پر انھوں نے غم سے مفاہمت سی کر لی ہے۔ وہ غموں سے گھبرانے کی بجائے اس کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس کو اس کا صدمہ نہیں کہ غم کیوں عطا کیا بلکہ یہ خیال ہے کہ غم جاوداں کیوں نہیں بخشا۔

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

کبھی وہ "قسمت کے حرف" مٹانے کے آرزومند ہوتے ہیں مگر "تقدیر" پانسہ پلٹ دیتی ہے۔ ایک مایوس انسان جس کو ہر طرف تاریکی نظر آئے جو دنیا کے ہر سہارے کو کمزور خیال کرے۔ وہ عام طور سے ہر سہارے کا دامن چھوڑ دیتا اور ہر ایک سے رشتہ توڑ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ حقیقی سہارے سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ مگر ان تمام مایوسیوں کے باوجود فانی "لا تقنطو" کا دامن نہیں چھوڑتا اور حقیقت میں یہی سبب ہے جو اس کا غم گراں بار اور بوجھل نظر نہیں آتا اور یہی باعث ہے کہ وہ غم کا خواہش مند ہونے کے باوجود غم پرست نہیں بنتا۔ ان کے یہاں غم کا عرفان ملتا ہے جو ان کی شاعری میں بدرجہ اتم ہے مگر وہ یاس پسند کبھی نہیں ہوئے۔ در اصل ان کے غم کے سیلاب کو 'ایقان' اور 'ایمان' ہلکا کر دیتے ہیں۔ چند اشعار سنیے اور بتایئے کہ ایک یاس پسند کے یہی تیور ہوا کرتے ہیں۔

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبا کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

یارب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی
لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہیے

صبر شایانِ محبت تو نہیں ہے لیکن
نکہ گر بن نہ پڑے شکوۂ بے داد نہ کر

وہ موت کی تمنا بھی کرتے ہیں تو اس خیال سے رک جاتے ہیں کہ ہماری موت اور زیست کا انحصار خدا کی مرضی پر ہے۔

کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جیئے جانے سے کچھ حاصل نہیں

مختصر یہ کہ فانی کے غم کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کا غم وجودی (EXISTENTIAL) غم ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق فانی وجودی نظریہ کے حامل ہیں۔ لیکن احساس غم اور استقبال غم میں وہ بہت کچھ وجودی فلسفیوں کے مماثل نظر آتے ہیں۔ وجودی فلسفہ کو غم سے خاص تعلق ہے۔ تقریباً ہر وجودی مفکر کے یہاں غم کا شدید احساس اور اعتراف نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مفکر زندگیٔ معتبر اور جیئے جانے میں امتیاز کرتے ہیں۔ جہاں تک جیئے جانے یا محض حیوانی حیات کا تعلق ہے۔ حیوانات اور جدید سائنسی تحقیق کے مطابق نباتات بھی ذی حیات کہے جانے کے مستحق ہیں۔ لیکن زندگی یا زندگیٔ معتبر کا مصداق صرف انسان ہی ہو سکتا ہے۔ فانی اپنے اس شعر میں وجودی عقیدے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہر زندگی کا نام نہ رکھ دل کی زندگی ایمان زندگی پہ نہ لا آزما کے دیکھ

غرض وجودی فلسفی زندگی کو ایک طے شدہ حقیقت کی طرح قبول کرنے کی بجائے ایک اہم تجربہ کی حیثیت سے اس کو دیکھتا ہے۔ وہ زندگی کی خود بینی و خودنگری کا قائل ہے۔ یہ سنجیدہ نظر اور خودنگری اس کو زندگی کے غم و الم سے آشنا کرتی ہے۔ ڈنمارک کے اور وجودی فلسفہ کے بانی میک ٹاگرٹ (TAGGART) کے یہاں غم کی لہر اس کے شدید احساس اور غیر معمولی تجربات زندگی سے پیدا

گئی ہے۔ فرانس کا وجودی فلسفی سارتھر SARTRE اختیار اور ذمہ داری کے بوجھ سے دب کر اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنے ملحدانہ فلسفہ میں کوئی روشنی نہ پاکر درد و کرب سے چیخ اٹھتا ہے۔ اسی طرح مارشل MARSHALL اور یاسپر (TASPER) تصور مرگ یا تمنائے ل کی شکست سے درس غم لیتے رہیں۔ بعض کے یہاں زندگی معتبر یا وجود برائے خود سے محروم ہو کر وجود محض میں تبدیل ہو جانے کا خوف، احساس غم و الم کا باعث بنتا ہے غرض ان تمام فلسفیوں کے یہاں ایک چیز مشترک ہے۔ ان کا غم ایک طرف تو ذاتی اور شخصی غم ہے اور دوسری طرف ان کے فلسفیانہ نقطۂ نظر اور موشگافیوں کا رہین منت ہے۔ فانی کے غم کے متعلق بھی ہم یہی بات دہرا سکتے ہیں کہ ان کا غم شخصی اور انفرادی ہوتے ہوئے بھی ان کی فلسفیانہ نظر سے گہرائی اور گیرائی حاصل کرتا ہے۔ ان کی صوفیانہ روش اس کو عظمت اور تقدیس بخشتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر ان کی شاعری کو کتاب غم کی تفسیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ فلسفۂ غم کی تشریح اور تفسیر کرنے والوں میں فانی کی ذات سب سے ممتاز اور منفرد نظر آتی ہے۔

عشق یا محبت ایک عالمگیر جذبہ ہے جو متمدن سے متمدن اقوام اور وحشی سے وحشی قبائل کے یہاں مشترک نظر آئے گا۔ جذبے کے لطافت یا کثافت سے یہاں بحث نہیں۔ مگر کسی نہ کسی شکل میں وہ سب کے یہاں موجود ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ محبت سے حیوانات بلکہ نباتات و جمادات بھی محروم نہیں۔ رومی نے کہا تھا۔

عشق جوشد بحر را مانند دیگ　　　عشق ساید کوہ را مانند ریگ

یہاں اس کی ضرورت نہیں کہ عشق کے بارے میں صوفیہ۔ اطبا۔ عقلا۔ شعرا

کے مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے لائے جائیں۔ ہمیں یہاں صرف یہ دیکھنا ہے۔ فانی نے عشق کو کیا سمجھا اور اس کا کیا تصور پیش کیا ہے۔

فانی کی شاعری صرف فکری نہیں جذباتی بھی ہے اور انھوں نے جہاں عشق یا معشوق کا ذکر کیا ہے وہاں ٹھہرے اور سلجھے ہوئے بلکہ پاکیزہ اور بلند جذبات کی ترجمانی کی ہے اگرچہ وہ باقاعدہ صاحب حال و قال نہیں نہ ان کو کسی خانوادۂ تصوف سے بیعت و ارادت کا تعلق حاصل ہے۔ وہ جس ماحول میں پلے بڑھے تھے وہاں تصوف کا زیادہ چرچا بھی نہ تھا۔ ان کے والد عقیدتاً اہل حدیث تھے اس لئے بیعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ فانی کو ذاتی طور پر تصوف سے روحانی لگاؤ تھا۔ ان کے جذبات واقعی اور ان کا عشق صادق تھا۔ ان کا عشق برائے گفتنی یا روایتی نہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں ڈوب کر اور محسوس کر کے کہتے ہیں۔ اور جو ترانہ نکلتا ہے ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے۔

ہزار ڈھونڈھیے اس کا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے، آستاں نہیں ملتا

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

وہ جلوہ مفت نظر تھا نظر کو کیا کہیے
کہ پھر بھی ذوق تماشا نہ کامیاب ہوا

تری تلاش کا افسانہ گر بیاں ہوتا
وہ مجاز کا ہر ذرہ اک زباں ہوتا

وہ جب خیال کرتے ہیں کہ ان کی ہستی محبوب سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی تو ان کو یک گونہ کیف حاصل ہوتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا
اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

وہ تو میرے سامنے تھے دیکھنے کی دیر تھی
میں نے آنکھیں بند کر لیں ورنہ کچھ نہ تھا

حسن ہو ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

عشق ہے پرتوِ حسنِ محبوب　　آپ اپنی ہی تمنّا کیا خوب

انھوں نے وحدت الوجود کو ہمیشہ اپنے لئے اکسیر بھی سمجھا ہے اور ہر مرض کی دوا بھی۔ اس نے ان کی روحانی تعمیر میں حصہ لیا ہے اور ذہنی سکون کے کام بھی آیا ہے۔ جب وہ دنیا کے انکار سے آزردہ۔ اہل دنیا کے برتاؤ سے افسردہ اور امواجِ حوادث کے تلاطم سے مضطرب ہوتے ہیں تو یہی اعتقاد ان کی آخری تسکین کا وسیلہ بنتا ہے۔ فانی کے نظریۂ تصوف پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں اس لئے اس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ البتہ یہاں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کے یہاں عشق کا تصور عام طور سے عشقِ حقیقی کے معنی میں آیا ہے۔ اور وحدت الوجود کا عقیدہ ان پر اس قدر حاوی ہے کہ عشقِ مجاز کا رنگ اس کے سامنے پھیکا پڑ گیا ہے۔ اگر اس پر بحث کی جائے تو خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے ہم یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

کثرت تکرارِ حسنِ وحدت کا نام ہے۔

کثرت میں دیکھتا جا تکرارِ حسن و حدت　　مجبورِ یک نظر آ، مختارِ صد نظر جا

وحدت حسن کے جلوؤں کی یہ کثرت اے عشق　　دل کے ہر ذرے میں عالم ہے پری خانے کا

بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ　　آئینہ اٹھا۔ حسنِ خود آرا سے گذر جا

غم کا یہ اعزاز کم نہیں کہ دوست کی مرضی کا دوسرا نام ہے۔

زندگی یادِ دوست ہے یعنی　　زندگی ہے تو غم میں گذرے گی

زہے تقدیرِ ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھہری　　تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

ناظر کی ہستی منظور سے الگ نہیں۔ اس لئے نظارہ محال ہے۔

اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارۂ جمال　　منہ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا

لیکن اوپر کے بیان سے ہرگز یہ قیاس نہ کرنا چاہیئے کہ ان کی حیثیت صرف ایک

صوفی شاعری ہے وہ دراصل غزل کا شاعر ہے۔ اور ان کی غزل تمام سرمایۂ شعر اردو میں ایک انفرادی اور بلند رتبہ رکھتی ہے۔ اور یہ بات (خواہ غزل کے معائب میں داخل ہو یا محاسن میں) ایک امر مسلّم ہے کہ وہ بڑی حد تک عشق مجازی کی ترجمان ہوتی ہے۔ غزل ہمارے ماحول، ہمارے کلچر۔ اور ہمارے داخلی مزاج کی خاص پیداوار ہے خود عشق و محبت، حسن و شباب اور وصل و ہجر کے نغمے جن کا صنف غزل سے خاص اور گہرا تعلق ہے جب غزل میں جگہ پاتے ہیں تو ایک تہذیبی قوت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جہاں محبت میں مجاز کا رنگ نمایاں ہوتا ہے وہاں اکثر مذاق سلیم مکدّر ہونے کے بجائے محظوظ ہوتا ہے۔ آیئے اس نقطۂ نظر سے فانی کے کلام پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان کے عشق مجاز کا تصور کیسا تھا۔

محبوب کی ادائے خود فراموشی۔

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا　　اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

معشوق کی کافر ادائی :۔

اک کفر سراپا نے کیا حشر کا قائل　　میں معتقدِ حشرِ مجسّم نہ ہوا تھا

محبوب کی آمد سے گھر کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ دیکھیے اس کو کس طرح بلاتے ہیں:۔

تم نے دیکھا ہی کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ　　آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

عاشق کی تباہی مسلّم ہے اور ان کی قسمت میں خوش بختی کا وجود ہی نہیں ہے۔

وعدے کی رات گردشِ افلاک رُک گئی　　جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو لاگ　　ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیانہ تھا

غزل کی خصوصیات میں جمالیاتی حسن اور تخیل کی کارفرمائی بھی شامل ہے اس کی بنیاد ہی تخیل اور جذبہ کے امتزاج پر ہے۔ جمالیاتی حسن کی کوئی ایسی تعریف ممکن نہیں ہے جو مکمل ہو اور کوئی ایسا سانچہ نہیں ہو جس پر جمالیاتی احساس کو

وہ شام وصل دشمن زلف سلجھاتے ہیں رک رک کر
انھیں یاد آگئیں کیا گتھیاں میرے مقدر کی

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

ان کا عشق تجریدی یا خیالی نہیں ہے وہ اس کے پیچ و خم سے گذرے ہیں اور اس کے نشیب و فراز سے واقف ہیں۔ اشعار ذیل سے ہمارے دعوے کی تائید ہو سکتی ہے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہونچی تری جوانی تک

اب انھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دور دلہن بن کے شباب آتا ہے

کتنے فتنے جمع کئے ہیں ان کی ایک جوانی مے
چال قیامت، کافر نظریں، آنکھ شرابی کیا کہئے

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

یہاں ہم تھوڑی دیر رک کر اس ظاہری تضاد پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں جس کا فانی کو کبھی کبھی ملزم ٹھہرایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سنجیدگی اور صداقت پرستی کی روشنی میں یہ امر محال ہے کہ ایک شخص حقیقی عشق سے وابستگی رکھتے ہوئے عشق مجاز کے ترانے گائے۔ یا محبوب مجازی سے لو لگانے کے ساتھ محبوب حقیقی کی محبت کا ساز چھیڑ دے۔ لیکن ایسا کہنا قرین قیاس نہیں ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مجاز کو حقیقت کا پرتو سمجھتا ہو یا حسن مجازی کے مشاہدے سے اس کو حسن کے اصلی سرچشمے کی

ڈھالا جا سکے اس کے لئے وجدان کا سہارا لینا ہوگا۔ غزل اور خصوصاً داخلی غزل کی سب سے بڑی ضرورت ہے جس کو جمالیاتی حسن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس طرح جذبہ اور تخیّل کا امتزاج شعر کو نکھار دیتا ہے۔ اگر صرف تخیل ہے اور جذبہ نہیں تو وہ ایک ایسی عمارت کی مانند ہے جو ہوا میں معلق ہو اس کے برعکس بغیر تخیل کے جذبہ ایک ایسا عمل ہے جس کو روح کی بالیدگی سے کوئی تعلق نہیں۔ فانی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غم کی گراں باری کے باوجود کہیں بھی تخیل اور جذبہ کے امتزاج کو فراموش نہیں کیا، جس کی وجہ سے اس کا جمالیاتی حسن برقرار رہا۔

درد کو پھر ہے میرے دل کی تلاش
خانہ برباد کو گھر یاد آیا

ہر تبسم پہ یہ کھاتا ہوں فریب
کہ انھیں دیدۂ تر یاد آیا

چن لیا تیری محبت نے مجھے
اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

مطلب یہ ہے کہ آج ہوئی نذر دل قبول
ارشاد ہے کہ آئینہ ہم روبرو کریں

بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے
کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

فانی کے کلام میں نزاکت خیال اور ندرت ادا کی مثالوں کی بھی کمی نہیں، دل اور دل کی خلش اگرچہ پامال مضمون ہے مگر دیکھئے اس کو فانی کس طرح ادا کرتے ہیں۔

تجھے خبر ہے ترے تیر بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

وہ نام ہیں ہستی و فنا ایک ہی دل کے
مارا ہے اسی دل نے جلایا ہے اسی نے

مژدہ انجام غم کے پہلو میں
دل بہ عنوانِ درد رہتا ہے

ندرت خیال اور ندرت ادا کی چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں:۔

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

دہاں بکھے سے اب تک [illegible] بڑا تھا جس جگہ راہِ محبت میں قدم میرا

تلاش ہو۔ البتہ جس طرح ہر چیز کے حدود و قیود ہیں یہاں بھی پابندیاں موجود ہیں چند
مثالیں اور سنئیے :-

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

آئی ہے اے نسیم تو اس وقت تک ٹھہر
جب تک بجھے چراغ ہمارے مزار کا

میں نزع میں ہوں عہد وفا کا محل نہیں
وعدہ نہ کر کہ وقت نہیں اعتبار کا

راز عشق میں اخفا کی شرط ہے۔

دل کے سوا یہاں کوئی محرم درد دل نہیں
بے خبروں سے کیوں کہیں، اہل خبر سے کیا کہیں

درد عشق زندگی بھر کا روگ ہے۔

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گذر گیا
عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا

آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیران زندگی
یعنی جمال یار کا صدقہ اُتر گیا

فانی کی زندگی غم دوراں اور غم جاناں کی نذر ہوئی۔ اور دونوں میں
ان کو مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں
یہ واردات کبھی کرب و اضطراب کی صورت میں نمودار ہوئی اور کبھی طنزیہ پیرایہ
اختیار کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ طنز کا اظہار اعلیٰ ذہانت طبع اور قدرت
کلام کا امتحان ہوتا ہے۔ دیکھئے فانی کس طرح اس سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانی
آپ کی جان سے دور آپ کے مرجانے کا

کچھ اُمید کرم میں گذری عمر
کچھ امید کرم میں گذرے گی

خود مسیحا خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں
زخم دل پیدا کریں یا زخم دل اچھا کریں

کہتے ہیں حسن ہی کی امانت ہے درد عشق
اب کیا کسی کے عشق کا دعوا کرے کوئی

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے خیال میں ندرت، انداز میں انوکھاپن جذبات میں خلوص اور بیان میں سنجیدگی ہے۔ ان کے کلام میں رکاکت اور ابتذال کا نام نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ ان گنے چنے افراد میں سے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو پستی سے نکالا۔ غزل کو آبرو بخشی اور اس میں وہ لطافت سمو دی جو حضرت فارسی کے معدودے چند اساطین غزل کے حصے میں آئی ہے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔

فانی کا تصوف

غزل کا مزاج دراصل عاشقانہ ہے۔ اس کے خمیر میں سب سے زیادہ جس چیز کا عنصر غالب ہے وہ حسن و عشق کے نغمے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غزل کی آفاقیت اور لچک نے دوسرے تصورات کو اپنا تو لیا مگر ان کو اپنا خاص موضوع نہیں بنایا۔ تصوف کی بنیاد بھی چوں کہ جمالیاتی تصور پر قائم تھی۔ اس لئے غزل اور تصوف ایک دوسرے سے جلد مانوس ہو گئے۔ تصوف کی راہ سے جو بھی موضوع غزل میں داخل ہوئے وہ اس کے لئے اجنبی نہ تھے۔ رفتہ رفتہ تصوف نے غزل کے مزاج میں اس حد تک دخل پا لیا کہ وہ غزل پھیکی معلوم ہونے لگی جس میں تصوف کی چاشنی نہ ہوتی۔ کیا مومن کی ان کے عہد میں عدم مقبولیت کا ایک سبب یہ نہیں ہے کہ ان کا کلام تصوف کے عناصر سے خالی تھا۔ یہ ضرور ہے کہ تصوف غزل کا ایک اہم جزو تھا مگر یہ وہ سنگلاخ وادی تھی کہ ہر شخص کی ہمت اس وادی میں قدم رکھنے کی نہ ہوتی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ صوفیانہ شاعری تو رسمی طور پر بھی نبھ جاتی تھی۔ لیکن صحیح معنی میں صوفی شاعر ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر لوگ صوفیانہ اشعار کہتے بھی تھے تو اس لئے کہ غزل کا رجحان غالب وہی تھا اور یہ محرک اس قدر قوی تھا کہ ہمارے شعرا عقیدہ کے لحاظ سے خواہ صوفی ہوں یا نہ ہوں مگر صوفیانہ اشعار کہنا فرض خیال کرتے۔ رہے صوفی شعرا یہ وہ افراد تھے جو ورائے شاعری چیزے دگر کے ساتھ

بیان کی سنجیدگی۔ لب و لہجہ کی نرمی۔ زندگی کے پوشیدہ رموز سے آگہی۔ فنائیت اور سپردگی۔ نامرادی و بر شتگی۔ استغنا و بے نیازی کے اوصاف سے متصف تھے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے امتزاج سے صوفیانہ خمیر تیار ہوتا ہے۔ اور جب کسی شاعر کے یہاں یہ خصوصیات زمانہ کے نشیب و فراز یا ذہنی صلاحیت کے باعث نمایاں ہوتی ہیں تو ہم اس کو صوفی شاعر کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اردو شاعری میں صوفیانہ شاعری کی تو فراوانی ہے مگر صوفی شعرا معدودے چند ہی ہوئے ہیں۔ ہمارے خیال میں فانی اگر صوفی شاعر نہ تھے تو کم از کم وہ اس مقام تک ضرور پہونچ گئے تھے جہاں صوفی شعرا کی سرحد شروع ہوتی ہے اور اس میں شاید دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ان کی شاعری بھی صوفیانہ شاعری کی راہوں سے براحل دور تھی۔ وہ جو کچھ کہتے تھے وہ بہ مجوائے قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر کہتے تھے اور خود محسوس کرکے کہتے تھے اور جو کوئی بھی ان کے کلام کو پڑھے گا وہ یقیناً اس نتیجے پر پہونچے گا کہ یہ نیا انداز فکر اور یہ انوکھا اسلوب بیان ایک روایتی شاعر کے اختیار سے باہر ہے۔

فانی کی شاعری کے اس پہلو پر بحث کرنے سے پہلے ضرورت ہو کہ تصوف کے مبادیات پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ صوفیانہ فکر کا آغاز کیوں کر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان فطری طور پر سب سے پہلے جس سے روشناس ہوتا ہے وہ خود اس کی اپنی شخصیت ہے۔ اسی لئے ڈیکارٹ نے کہا ہے کہ I THINK, THEREFORE, I EXIST جس کے بارے میں فلاسفہ کا خیال ہے کہ مغرب میں یہ پہلی قطعی آواز تھی جو اور اک ذات کے سلسلہ میں بلند کی گئی۔ جب ہم کسی امر کے بارے میں سوچتے ہیں تو پہلے سوچنے والی ہستی یعنی انا (EGO) کا ادراک سامنے آتا ہے۔ حتیٰ کہ تشکیک یا عنادیہ

جو حقایق عالم اور نیز اپنی ہستی میں شک کرنے والے یا منکر کہے جاتے ہیں۔ وہ بھی اس ادراک سے دامن نہیں بچا سکتے۔ کیوں کہ یہ تعنید (کہ مجھے فلاں شے کے وجود میں شک یا انکار ہے) اس امر پر منحصر ہے کہ کم از کم شک و انکار کرنے والی ذات وجود رکھتی ہے۔ یہ ادراک ہر بچے سے لے کر بڈھے میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اقبال کہتے ہیں۔

کودکے را دیدی اے بالغ نظر — کہ بود از معنیٔ خود بے خبر
سادہ و دوشیزہ انکارش ہنوز — چوں گہر پاکیزہ گفتارش ہنوز
جست جو سرمایۂ پندار او — از چرا۔ چوں۔ کے۔ کجا گفتار او
فکر خامش در ہوائے روزگار — پرکشا مانند باز نوشکار
در پئے نخچیر ہا بگذاردش — باز سوئے خویشتن می آردش
چشم گیرائش فتد بر خویشتن — دستکے بر سینہ می گوید کہ "من"
یاد او با خود شناسائش کند — حفظ ربط دوش و فردائش کند
گرچہ ہر دم کاید افزاید گلش — "من ہمانستم کہ بودم" در دلش

ایں "من" نوزادہ آغاز حیات
نغمۂ بیدار ہی ساز حیات

جتنی عمر بڑھتی جاتی ہے انا کا ادراک قوی ہوتا جاتا ہے پھر جب انسان اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ماحول میں جو اشیا ہیں وہ یا تو اس کی مانند ہیں یا اس سے فروتر، تاہم ان میں بہت سے اوصاف مشترک ہیں۔ یہ مادی دنیا کے شعور کی منزل ہے۔ اب وہ ایک قدم اور بڑھاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میرا ذہن چند تصورات کلی یا حقایق مطلقہ (حق۔ جمال۔ خیر) کی جولاں گاہ ہے۔ مگر یہ تصور آئے کہاں سے۔ میری ذات یا کائنات

کی اشیا میں جن کی حیثیت جزئیات کی ہے۔ ان کلیات کا سراغ نہیں ملتا۔
لامحالہ کوئی ذات یا ہستی ایسی ہے جو نہ صرف حق۔ جمال اور خیر مطلق سے متصف
ہے بلکہ ان کا سرچشمہ ہے اور اسی کے فیضان سے یہ اورا کات میرے ذہن
و ضمیر پر منعکس ہوئے ہیں۔ غرض اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ عالم کے تجربات اور
تصورات کلی یا حقایق مطلقہ کی طرف تو رہنمائی تو ضرور کرتے ہیں لیکن خود
ان حقایق کے حامل نہیں ہیں۔ ایک قدم اور۔ اور یہی فیصلہ کن قدم ہے۔
یعنی انسان یہ غور کرنے لگتا ہے کہ مجھ میں اور اس ذات میں کیا علاقہ ہے۔ بظاہر
وجود ایک قدر مشترک ہے جو مجھ میں اور اصل ذات میں وجہ اشتراک ہے
لیکن دونوں کا وجود یکساں نہیں ہوسکتا۔ (جیسا کہ اوپر کے نفسیاتی تجربے
سے واضح ہو چکا ہے) پھر دیکھنا ہے کہ اگر فرق ہے تو کیا۔ یہ فرق کمیت
(QUANTITY,) کے لحاظ سے ہے یا کیفیت (QUALITY) کے اعتبار
سے۔ اگر کمیت کا فرق مانتے ہیں تو طبیعت خود ابا کرتی ہے۔ عقل اور کشف
بتاتے ہیں کہ کمیت کا فرق کوئی اہم فرق نہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے
دو قیمتی کمخواب کے ٹکڑے ہیں۔ ایک پانچ گز کا اور دوسرا صرف گز بھر کا۔
خالق کائنات اور مخلوق کا فرق اگر یہی ہے تو محض سطحی ہے۔ اس لئے لازم
آیا کہ وہ فرق کیفیت کا ہو۔ یعنی اس کا وجود واجب ہو۔ ہمارا ممکن۔ اس کی
ہستی حقیقی ہو۔ ہماری غیر حقیقی۔ اس طرح عرفان نفس عرفانِ رب کا زینہ بن
جاتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو گیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کائنات کی
تخلیق کی حکمت کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اشیائے کائنات عدم کے
آئینے ہیں جن میں ذات واجب نے اپنی صورت دیکھنا چاہی۔ جب ایسا ہے
تو ہمارا منتہائے نظریہ ہونا چاہیئے کہ ہم جہاں تک ہو سکے اس ہمہ حق۔

ہمہ جمال۔ ہمہ خیر ذات کا قرب حاصل کر سکیں۔ یہی عقیدہ ہے جس کو تصوف کہا جاتا ہے اور جس کا وجود دنیا کی تقریباً ہر قوم کی فکری اور مذہبی تحریکات میں ملتا ہے۔ غالباً افلاطون یونانی (۴۲۹ - ۳۴۷ ق م) پہلا شخص ہے جس نے دنیا میں تصوف کی آواز بلند کی۔ اس سے پہلے اس دعوت کے ذکر سے تاریخی دستاویزیں خاموش ہیں۔

افلاطون کے بعد فلاطینوس جو فلاطون الٰہی یا الشیخ الیونانی (۲۰۴ - ۲۷۰ مسیحی) کہلاتا ہے اور اس کے بعد اس کے شاگرد فرفوریوس نے جس کو متصوف فلاسفہ میں خاص امتیاز حاصل ہے ان عقائد کی توجیہ اور توضیح نئے ڈھنگ سے کی جس کی بنا پر اس نظام تعلیم کو نو افلاطونیت یا (NEO PLATONISM) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک وجود کے کئی مدارج ہیں۔ (۱) ذات حقیقی (۲) عالم مثالی اور عالم ارواح (۳) عالم اجسام۔ ذات حقیقی واحد، غیر محدود سرچشمۂ حیات اور کائنات کی علت اصلی ہے اور باقی اس کے سائے اور عکس ہیں۔

یہاں ہمیں نو افلاطینت کے بنیادی عقائد۔ یا ہندوؤں یا یہودیوں اور دوسری اقوام کے متوازی افکار سے۔ نیز اسلام میں تصوف کے خیالات سے بحث کرنا مقصود نہیں۔ اور نہ ہم کو تاریخی اعتبار سے اس عقیدے کے مختلف مآخذ اور ادوار پر روشنی ڈالنا ہے۔ کیونکہ اس طرح ہم اصل مبحث سے بہت دور جا پڑیں گے۔ فی الحال دیکھئے کہ صوفیہ نے تصوف کی تعریف میں کیا کہا ہے۔ در اصل ہر شخص نے اس پر کسی خاص پہلو سے نظر ڈالی ہے یہی وجہ ہے کہ چلتے ہنر اتنی باتیں۔ اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ شیخ

ابو الحسن احمد فرماتے ہیں :-

"تصوف نفس کی ہر خواہش کو ترک کرنے کا نام ہے"۔

ابو عمرو دمشقی کہتے ہیں :-

"تصوف یہ ہے کہ کائنات کو چشم حقارت سے دیکھے بلکہ اس کی طرف سے آنکھ ہی بند کر لے"۔

حضرت جنید کہتے ہیں کہ :-

"تصوف یہ ہے کہ حق تیرے انا کو فنا کر کے تجھے اپنے ذریعے سے بقا عطا کرے"۔

شیخ ابو سعید کا ارشاد ہے :-

"تصوف آنست کہ انچہ در سر داری بنہی وانچہ در کف داری بدہی وانچہ بر تو آید نہ جہی"۔

کوئی اسے تفسیح الخیال سے تعبیر کرتا اور کوئی تعمیر الظاہر والباطن قرار دیتا ہے تاہم ہر دبستان فکر میں یہ قدر مشترک ہے کہ وجود حقیقی صرف ایک ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بے حقیقت ہے۔ یہ نقطہ نظر اصل ہے اور تمام افکار و اعمال کی تفصیلات اس کی فروع ہیں۔ جب تک ایک صوفی سالک ذات حق کو اصل نہ جانے گا اور اس کے سوا ہر کسی کو کالعدم نہ مانے گا تصوف کے تقاضوں پر عمل کرنا اور نفس کی خواہشوں پر قابو پانا ممکن نہیں۔

تصوف پر منحصر نہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو کسی نہ کسی شکل میں اس نقطہ نظر اور اصل الاصول کا قائل نہ ہو۔ نماز، روزہ، حج، جہاد، زکوٰۃ، صدقہ خیرات۔ دال میں ہر ایک کی بنائے کار یہی ہے۔ ان میں سے ہر عمل ہم سے ایثار و قربانی کا طالب اور کسی نہ کسی حد تک فنائے ذات کا متقاضی ہے۔ ہم

اپنا وقت۔ اپنا آرام۔ اپنا خواب و خور۔ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت اور اپنی جان کسی کی خوشنودی کی خاطر تج دینے پر مامور ہیں اس کا صاف مقصد یہ ہو کہ ہم، ہماری ذات اور اس کے متعلقات۔ خود پرستی۔ خود پروری اور خود نمائی کے لئے نہیں بلکہ کسی دوسری ذات کی ملکیت ہیں جس کی منشا سب سے مقدم اور جس کی مصلحت سب سے اہم ہے۔

آمدم بر سر مطلب۔ اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع پر آتے ہیں۔ (محبت حقیقی ہو یا مجازی) بے پناہ طاقت رکھتی ہے اور جب وہ شاعری سے امتزاج پاتی ہے تو کھینچ کر تلوار ہو جاتی ہے۔ جب شاعر محبت کی اس منزل پر پہونچ جاتا ہے جہاں حسن و عشق کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ من و تو کے حجابات حائل نہیں رہتے۔ وہم و گمان کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے وجود کو محبوب کی ذات سے جدا خیال نہیں کرتا۔ ع "اس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے وہم" تب یہ شاعری وجود میں آتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ فانی کے تصوف سے کیوں کر وابستگی ہوئی پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی کی رائے ہے کہ "فانی کے یہاں تصوف غم دنیا سے پناہ کی راہ سے آیا ہے" ہمیں اس سے انکار نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمارا عقیدہ ہے کہ ان کا تصوف عام شعرا کی طرح روایتی نہیں ہے۔ ورنہ ان کی شاعری میں وہ خلوص نہ ہوتا جس نے ان کے کلام کو تیر و نشتر بنا دیا اور درجۂ کمال تک پہونچا دیا ہے۔ خود پروفیسر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ ان کا تصوف اصلی تھا۔

"تصوف کا عنصر ان کے یہاں واقعی اور اصلی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عملی تصوف سے ان کی زندگی نا آشنا رہی تاہم نظری تصوف ان کے یہاں محض رسماً یا برائے گفتن نہیں ہے۔"

فانی یاسیات کے امام کہے جاتے ہیں۔ اور ان کے انکار کی اساس شوپنہاور کی طرح زدر و غم ہے۔ مگر شوپنہاور خدا کے وجود کو اور اس کی مشیت کو (معاذ اللہ) ایک اندھی اسکیم سے تعبیر کرتا ہے اور فانی اس کے خلاف متصوفانہ نظر رکھتے ہیں۔ ہیگل شاعری کو حقیقت مطلق کے اظہار کا ذریعہ بتاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی مادہ پرست ایک ایسے وجود کے اعتقاد کو اور اس کی طلب کو لاحاصل قرار دے مگر یہ ایک امر بدیہی ہے کہ اس کے بغیر انسان کے اعلا مقاصد ہمیشہ اس کی نظر سے روپوش رہتے ہیں۔ اور حیات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ فانی کو تصوّف کی شاعری میں ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ ان کی حیثیت نہ اس مذہبی زاہد کی سی ہے جو مسند ارشاد پر متمکن ہے اور نہ اس فلسفی کی سی جو خشک مسائل کو اپنا اوڑھنا بچھونا قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوّف میں فانی کا بے پایاں خلوص شامل ہے۔ جس میں ان کے فلسفیانہ ذہن و طبیعت نے نکھار پیدا کر دیا ہے۔ دل میں محبت کی کسک تھی۔ طبیعت میں فلسفہ کا مذاق تھا۔ ان دونوں کے خمیر سے تصوّف کا وجود ہوا۔

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ غالب کی فکر اور میر کی یاس نے فانی کا پیکر اختیار کر لیا تھا کہ ہمیں اس صداقت سے انکار نہیں۔ مگر یہ صداقت ادھوری ہے۔ در اصل فانی کی فکر میں غالب سے زیادہ گہرائی اور ان یاس میں میر سے زیادہ نشتریت ہے۔ وہ صوفی شاعر نہیں بلکہ فلسفی شاعر ہیں۔ تاہم ان کی صوفیانہ شاعری میں میر درد سے زیادہ گہرائی ہے۔ اردو کی صوفیانہ شاعری میں اگر کوئی شاعر ان کے قریب پہونچتا ہے تو وہ حسرت اصغر ہیں۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس زمانہ ہی میں اصغر بھی ان کے پیچھے رہ جاتے ہیں جیسا کہ آئندہ مثالوں سے واضح ہوگا۔ فکر کی اس نادرہ کاری کا سراغ کہاں تک

پہونچا ہے اس کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اول تو وہ خود قدرت سے ایک سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے جو ہر حقیقت کا راز دریافت کرنے کو بے تاب رہتا تھا۔ اوپر سے فلسفہ کا مطالعہ کیا جس نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ اسی کے ساتھ ایک پروردۂ غم اور چوٹ کھایا ہوا دل ان کے پہلو میں تھا۔ یہ چوٹ اگرچہ مجاز کی راہ سے آئی تھی مگر ایک ذرا نگاہِ ہستی کی زندگی میں مجاز کو حقیقت کے بام تک پہونچنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ حقیقت کی یہی شعلہ باریاں ہیں جو بجلی بن کر ان کے یہاں کوندتی ہیں اور یہی وصف ہے جس نے ان کے کلام کو ورائے شاعری چیزے دگر ہست کا مصداق بنا دیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ محبت جذبات انسانی میں ایک قوی اور شدید جذبہ ہے اور جب اس کا محور فانی انسان نہیں بلکہ وہ لافانی ذات ہو جو کمال میں لازوال اور جمال میں بے مثال ہے تو اس کی قوت اور شدت کا کیا پوچھنا۔

جرعۂ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف اگر باشد ندانم چوں کند

فانی کے کلام میں تصوف کا عنصر اس قدر وافر اور انداز بیان اتنا موثر ہے کہ ان کی صوفیانہ شاعری کو ہرگز ہرگز روایتی نہیں کہہ سکتے۔ ذرا فانی کو صوفی کے روپ میں دیکھئے اور مثال کے طور پر ان کے عقیدہ وحدت کو لیجئے۔ صوفیہ کا ہر دبستان فکر (خواہ وہ ہمہ اوست کا قائل ہو یا ہمہ از اوست کا) ذات حق کی وحدت پر کامل اعتقاد رکھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر تصوف کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تصوف کی پہلی منزل اپنی خودی کو مٹا دینا بلکہ تمام کائنات کی طرف سے منھ پھیر لینا ہے۔

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں　　شرط اول قدم آن است کہ مجنوں باشی

ذیل کی مثالوں سے ہمارا مطلب واضح ہوگا۔

تصوف میں تنزیہہ ذات (جو وجود کا مرتبہ اولیٰ ہے) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اسماء و صفات۔ نسب و اضافات بھی ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ سنیے فانی کس طرح اس مضمون کو ادا کرتے ہیں۔

ہر نام میں اک شانِ تعین ہے بہر حال　　جو بھی ہے ترا نام۔ ترا نام نہیں ہے

ہوالآن کما کان (وہ اب بھی ایسا ہی جیسا کہ تھا) کی یہ تفسیر اور اس کی یہ شاعرانہ تعبیر فانی ہی کا حصہ ہے۔ ہماری نظر نورِ ذات کا حجاب بن گئی ہے۔ مگر کیسا حجاب جو حجاب نور بھی ہے اور ذریعۂ ظہور بھی۔

میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا　　اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

اسی بات کو دوسری جگہ یوں کہتے ہیں :-

اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک　　اس مرحلۂ سعیٔ تماشا سے گذر جا

انھیں انہی کی نگاہوں سے میں نے دیکھ لیا　　مری نگاہ کا پردہ اٹھا کے آئے تھے

الاشیاء تعرف باضدادہا کی شرح سنئے :-

بقا کہتے ہیں جس کو وہ مرا احسان ہے فانی　　وہ حادث ہوں کہ دنیائے قدم بھرتی ہے دم میرا

حق تعالیٰ کی معرفت دشوار ضرور ہے مگر ماسوا کی معرفت دشوار تر ہے سبب یہ ہے

. . . .

. . . . کہ حق کے وجود کے دلائل تو قدم قدم پر ملتے ہیں مگر ماسوا کا وجود ہی محل نظر ہے۔

رازِ دل سے نہیں واقفِ دلِ ناداں میرا　　تیرے عرفاں سے بھی دشوار ہے عرفاں میرا

اس سے بڑھ کر نادر پیرایۂ بیان دیکھئے۔

یہ جستجو ہے کہ ہے عالمِ مجاز کہاں　　تلاش یہ چشمِ حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

دنیا ہمارے ذوقِ نظر کا نتیجہ ہے ورنہ کیسا عالم اور کہاں کا عالم۔

بے ذوق نظر بزم تماشا نہ رہے گی　　منھ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

غالب کے اس شعر کے بعد:-

ہو غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

دوسرے کے لئے پہلو بچا کر یوں کہنا جیسا کہ فانی نے کہا مشکل تھا۔

ہر جلوہ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں

نظارہ نظر میں شامل ہے نظارے میں شامل کوئی نہیں

مگر انصاف یہ ہے کہ غالب کا شعر ندرت کے اعتبار سے لاجواب ہے جب ایسا ہے تو دعویٰ وجود کی جو حقیقت ہے معلوم ہے۔

مرا وجود کفر۔ مری زندگی گناہ　　ہستی کو ہوش، ہوش کو لازم خودی ہوئی

فانی کو تنزیہ پر اس قدر اصرار ہے کہ عکس تو عکس، تجلّی کو بھی دوئی کا نشان خیال کرتے ہیں جس کو ذات کی بارگاہ میں بار پانا محال ہے۔

خود تجلّی کو نہیں اذنِ حضوری فانی　　آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

خدا اور ما سوا کی نسبت پر صوفیہ اور شعرا نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پیش نظر رکھیے اور فانی کے یہ اشعار پڑھیے

کس کو کہیئے ماسوا جب تو نہیں تو کچھ نہیں　　تو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا مجھے

صور و منصور و طور و ارے تو یہ　　ایک ہے تیری بات کا انداز

ان کو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ مجاز و حقیقت کی اصطلاحیں استعمال کر کے دوئی کا اقرار کیا جائے جو ان کے نزدیک وحدت کے انکار کے مترادف ہے۔

ہے کوئی شے تو بارہ جلوۂ یار　　یہ حقیقت ہو اور یہ اصل مجاز

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرق مجاز و حقیقت کیا

یہ عرض حقیقت ہے وہ حقیقت معنی باطل کوئی نہیں

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے   تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز

حق اور خلق میں کیا رشتہ ہے؟ تصوّف نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ خلق یا عالم یا کائنات کی خدا سے الگ کوئی ہستی نہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ جب سے خدا ہے اس کا علم بھی ہے، عقل قبول نہیں کرتی کہ وہ ذات ہو اور علم اس سے جدا ہو۔ علم اس کی اساسی ایجابی صفات میں سے ہے جو عین ذات ہے۔ پھر علم کے لئے معلومات کا ہونا ضروری ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ علم ہو اور معلومات نہ ہوں۔ یہی معلومات الٰہی۔ یا تصورات یا خیالات ہیں جو اعیان ثابتہ کہلاتے ہیں[1]۔ اور جو کائنات کی اصل ہیں۔ یعنی کائنات انھیں خیالات کا عکس یا پرتو ہے۔ یہ اعیان اس لحاظ سے تو ثابت اور یقینی ہیں کہ ذات حق کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ نفس باری تعالیٰ میں قائم ہیں، مگر اس لحاظ سے وجود سے معرا ہیں کہ ذات حق سے الگ اپنی خارجی ہستی نہیں رکھتے۔ ان کا وجود بھی اضافی اور عدم بھی اضافی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، یہی خیالات ہیں جو اس تمام کارخانے کی بنیاد

---

[1] اعیان ثابتہ ESSENCES EXISTING IN THE MIND OF GOD

یہاں ایک صوفیانہ نکتہ بیان کرنا شاید فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ قرآن مجید میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو حکم دیتا ہے کہ کن (ہو جا) تو وہ ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حکم کس کو دیا جاتا ہے۔ اگر شے موجود کو دیا جاتا ہے تو معاذ اللہ تحصیل حاصل اور فعل عبث ٹھہرتا ہے اور اگر غیر موجود کو دیا جاتا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک چیز موجود بھی نہ ہو اور مامور بھی ہو۔ صوفیہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس حکم کا اطلاق اعیان ثابتہ پر ہے یعنی حق سبحانہٗ ان معلومات و تصورات کو ایک اعتباری وجود قبول کرنے کا امر فرماتا ہے جس کو وہ بہ امتثال امر قبول کر لیتے ہیں۔ اور عالم وجود میں آجاتا ہے۔ یہی ان کے نزدیک تخلیق کا راز ہے۔

ہیں۔ دیکھئے فانی اس مضمون کو کس طرح ادا کرتے ہیں۔

ابتدائے زندگی، انتہائے زندگی ۔۔۔ آپ کے خیال سے آپ کے خیال میں

اس ایجاز و بلاغت کے ساتھ اس کی تشریح مشکل سے دوسری جگہ ملے گی[1]۔ کچھ مثالیں اوپر نظر سے گذریں۔ کچھ یہاں جا بجا بکھری ہوئی پیش خدمت ہیں۔

ترے خیال کے اسرار بے خودی میں کھلے ۔۔۔ ہمیں چھپا نہ سکے ورنہ دل کو کیا معلوم
ملتی نہیں تصور ہستی سے اب نجات ۔۔۔ گھر سا گیا ہوں حلقۂ دامِ خیال میں
آدمی میں کچھ نہیں، آپ نے سمو دیا ۔۔۔ عالمِ غبار کو عالمِ خیال میں
ایک عالم کو دیکھتا ہوں میں ۔۔۔ یہ ترا دھیان ہے مجسّم کیا

اس مقام کا عرفان ہونے کے بعد دنیا سراسر وہم نظر آتی ہے۔

واہمے کی یہ مشق پیہم کیا ۔۔۔ یاس و امید شادی و غم کیا
گرم و سرد زمانہ جو کچھ ہو ۔۔۔ ورنہ فردوس کیا جہنم کیا
مستی و ہوش کے فسانے ہیں ۔۔۔ جشنِ پرویزو عشرتِ جم کیا
غم تو واعظ غمِ بہشت بھی ہے ۔۔۔ امتیازِ غمِ جہنم کیا
یہ حجابات بھی اُٹھے آخر ۔۔۔ دلِ پُر درد و چشمِ پُرنم کیا

چند اور مثالیں سنیئے:۔

یہ نقش قدم ہیں رہ بے منزلِ دل میں ۔۔۔ فردا تو ہے فردا بس فردا سے گذر جا
کر قطع نظر وسوسۂ تلب و نظر سے ۔۔۔ ہر جلوہ پوشیدہ و پیدا سے گذر جا
کعبہ ہو کہ ہو دیر دنیا ہو کہ عقبیٰ ۔۔۔ ہر منزل و ہر جادہ و ہر جا سے گذر جا
تجلیات وہم ہیں مشاہدات آب و گل ۔۔۔ کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

---

[1] اس مضمون کو ایک دوسرے پیرایہ میں ایک اور کہنہ مشق استاد ثاقب بدایونی نے اس طرح ادا کیا ہے

مگر یہ کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی اور اگر ہمیشہ رہے تو نظام عالم قائم نہ رہے۔

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم　　گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

یہی وجہ ہے کہ سالک جو اس کا لذت آشنا ہے۔ اس لذت کے دوام اور اس کیفیت کے قیام کا خواہاں رہتا ہے۔ فانی کی شاعری میں موت و مرگ کی تکرار پڑھ کر اکثر حضرات کی پیشانی پر شکن آجاتی ہے اور وہ اپنے ظرف کی نمائش کرتے ہوئے ان کو 'سوز خواں' اور 'بیوۂ عالم' کے الفاظ سے یاد کرنے لگتے ہیں۔ مگر مادی اور جنسی چٹخاروں کی غلاظت میں لوٹنے والے فانی کے رسائیِ خیال کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ ان کی شاعری میں اوّل اوّل لکھنؤ کے ماحول کے اثر سے موت۔ کفن اور قبر کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن بعد کو ان کے یہاں فنا کا وہ مفہوم آتا ہے جب سالک اپنی ہستی۔ ہستی کے علائق۔ شادی و غم بلکہ تمام امتیازات و اعتبارات و تعینات کو تج دیتا ہے اور اس کے سامنے صرف ذات رہ جاتی ہے۔ بلکہ 'اس کے سامنے' کا فقرہ بھی خیال کے قامت پر تنگ اور مذاق تصوف کے لئے موجب ننگ ہو جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار ہماری تائید کے لئے کافی ہوں گے۔

اس حقیقت کو بھی افسانہ بنایا ہوتا　　دردِ دے کر دلِ فانی کو مٹا دینا تھا

ٹھہرا وہ دل کہ جب یہ سکون کا گمان تھا　　فانی فسونِ موت کی تاثیر دیکھنا

دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے　　لذتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی

دریا ہی میں تھم ڈوب کے دریا سے گذر جا　　کشتی کا سہارا ہی تو گرداب ہے فانی

کہاں سے لاؤں اعتبار مرگ کامیاب کا　　وہ حرفِ صد یقیں سہی حیات پھر حیات ہے

مرے سوا تھے اور جو پردے سارے کے سارے چاک ہوئے

یہ بھی اگر اللہ نے چاہا کوئی دم میں چاک ہوا

رسمی اور روایتی شاعری سے یہاں بحث نہیں۔ واقعی اور اصلی شاعری میں بھی ایسا دیکھا گیا ہے کہ شاعر ایسے ایک یا چند الفاظ بہ تکرار لاتا ہے جو اس کی روح کے بنیادی سُر KEY NOTE یا اس کے نظام فکر کے حقیقی محور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مومن کی غزلوں کے مقطعوں میں کفر و ایمان اور فانی کے یہاں فنا کو یہی درجہ حاصل ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ ان کی فکر کی رَو یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھتے اور فنا کو بقا کا زینہ سمجھتے ہیں۔

میں ہوں فانی صحیفۂ باقی — حرف بے معنئ فنا کی قسم
اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز — میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز
دیکھئے کیا ہو عشق کا انجام — دل کی ہستی ہے موت کا آغاز
حسن ہے جاوداں بے آغاز — عشق آغاز۔ جاوداں انجام
بہت تنگ ہے وہم ہستی کی دنیا — میں عالم ہی اب دوسرا چاہتا ہوں

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اب تک سیر الی اللہ کی منزل میں تھے۔ اب سیر فی اللہ کی راہ پر گامزن ہیں۔ پہلی منزل کی گیرائی اور دل آویزی مسلّم۔ مگر دوسری منزل کی نیرنگیاں اور حیرت سامانیاں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اس عالم بے مثال کی مثال (اگر ہو سکتی ہے) یوں سمجھیے کہ ہم ایک مقام سے بلا تشبیہ دلّی کی جانب روانہ اور راہ کے عجائب سے دوچار ہوئے۔ لیکن جب دلّی پہنچ گئے تو معلوم ہوا کہ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست ہر ہر قدم حیرت کا اور ہر ذرہ پر انوکھی کا منظر نظر آتا ہے۔

غرض کہاں تک تشریح کی جائے اور کہاں تک مثالیں دی جائیں ان کا دیوان درحقیقت ایک بحر محیط ہے جس میں ایسے ہزاروں گوہر

نایاب ملتے ہیں۔ لیکن اس بحث کے ختم کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ فانی اول نہ آخر ایک شاعر ہیں۔ شاعری ہی ان کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ ان کو فلسفی یا صوفی کہنا، دراصل حقیقت کی غلط تعبیر ہوگی وہ فلسفی تو اس لئے نہیں کہ انھوں نے کسی مربوط فلسفیانہ نظامِ فکر کی دعوت نہیں دی ہے۔ یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے ایک مقالے سے چند سطور نقل کریں۔

"گوئٹے نے ایک بہت ہی معنی خیز بات کہی ہے اور اسے اثر شاعر (ڈبلو۔ بی ایٹس) نے جگہ جگہ دہرایا ہے یعنی یہ کہ شاعر کو چاہئیے کہ وہ فلسفہ سے بخوبی واقفیت حاصل کرے۔ لیکن اسے اپنی شاعری سے باہر رکھے۔ فلسفہ چاہے خود اپنا ہو یا مستعاری ہو۔ شاعری میں بجنسہٖ جگہ نہیں پاتا۔ دراصل شاعری کے سلسلہ میں اس اصطلاح کا استعمال ہی غلط ہے۔ زندگی میں بصیرت اس کا بہتر مرادف ہو سکتا ہے۔ شیکسپیر یا غالب کے یہاں فلسفیانہ بصیرت ملتی ہے لیکن مجرد فلسفہ نہیں[1]"

اسی کے ساتھ ہم ان کو صوفی بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ جہاں تک ہمیں علم ہے وہ کسی خانوادۂ تصوف سے وابستہ نہیں تھے۔ وہ ایک عظیم شاعر تھے جن کو قدرت نے فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ صوفیانہ اندازِ نظر بھی عطا کیا تھا۔ اب ہم ان کے صوفیانہ اندازِ نظر کے چند دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

جبر و اختیار کا مسئلہ آج سے نہیں بلکہ ہزاروں برس سے انسانی عقول

---

[1] تعلیم و تدریسِ شعر (ساقی نومبر ۱۹۶۶ء) اسلوب احمد انصاری۔ صفحہ ۲۷

کو سرگرداں کئے ہوئے ہے کہ انسان مجبور ہے یا مختار۔ یہ امر جس قدر مذہبی
حیثیت سے اہم ہے اسی قدر فلسفیانہ نقطہ نظر سے بھی قابل غور ہے۔ اگر
ہم مجبور محض ہیں تو شریعت یا قانون سے کیا فائدہ۔ اس طرح تمام مصلحان عالم
کی سعی بلکہ معاذ اللہ انبیائے کرام کی بعثت ہی لغو ٹھہرتی ہے اور سزا و جزا کی
بحث ہی لاطائل قرار پاتی ہے اور اگر ہم مختار ہیں تو پھر یہ ماننا پڑتا ہے کہ
حق تعالیٰ کا ہماری زندگی اور اعمال پر کوئی گرفت نہیں۔ پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے
کہ ہم کسی امر کا مصمم ارادہ کر لیتے ہیں اور تمام اسباب ظاہری فراہم ہو جاتے ہیں
اچانک کوئی ایسا غیر متوقع حادثہ رونما ہو جاتا ہے جس سے ہمارے ارادوں
کی پوری عمارت زمین پر آ رہتی ہے۔ حکیم اسلام حضرت علی مرتضیٰ نے سچ فرمایا
تھا، عرفت ربی بفسخ العزائم (میں نے اپنے رب کو ارادوں کے فسخ ہو جانے سے پہچانا)
اسلام پر موقوف نہیں۔ ہر مذہب اور ہر مکتب فکر نے اس مسئلے کو خاص اہمیت کی نظر
سے دیکھا ہے۔ اسپنوزا کہتا ہے کہ "نہ ہم مجبور محض ہیں اور نہ اخلاقی قدروں سے گریز
کر سکتے ہیں۔ اس لئے عمل کی پوری ذمہ داری ہم پر ہے۔" اس کے برخلاف شوپنہار
کا عقیدہ ہے کہ "انسان مجبور محض ہے۔ اس کا نہ کوئی ارادہ ہے اور نہ اختیار۔
اس لئے اس پر سزا و جزا عائد نہیں ہو سکتی۔ اس آئینہ خانے میں ہماری شکل ایک
عکس کی سی ہے۔ جو صاحب عکس کا پابند ہے۔" خود مسلمانوں میں دو بڑے فرقے
جبریہ اور قدریہ اسی بنا پر وجود میں آ گئے۔ قرآن مجید میں جہاں انسان کی مشیت
کو خدا کی مشیت کا تابع بتایا گیا ہے وہاں سزا و جزا کی اہمیت پر بھی خاص زور دیا
گیا ہے۔ اسی لئے جمہور اہل اسلام جبر و قدر سے ہٹ کر بین بین کے قائل ہیں۔
اب دیکھئے کہ اس باب میں صوفیہ کا کیا موقف ہے۔ چوں کہ ان کے نزدیک ماسوا
کا کوئی حقیقی اور خارجی وجود نہیں ہے اس لئے لامحالہ ماسوا کے ارادہ و اختیار کی

بھی کوئی اصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا رجحان بیشتر جبر کی طرف ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس رجحان کے زیر اثر عمل کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بظاہر یہ صورت اجتماع ضدین کی سی معلوم ہوتی ہے لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ ہر بڑے نظام فلسفہ میں کبھی نہ کبھی اضداد سے سابقہ پڑ جاتا ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ایمان کی منزل خوف و رجا کے درمیان واقع ہے۔ فانی بھی جبر کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ تدبیر کو تقدیر کا محکوم مانتے ہیں۔ چند اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں

کیا یہ ساری عمر منہ تکتی رہی تقدیر کا ۔۔۔ میری تدبیروں کی مشکل اب تو یا رب سہل کر

ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا ۔۔۔ فکر راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی

راز تقدیر الٰہی کو نہ پوچھ ۔۔۔ حسن تدبیر نہ رسوا ہو جائے

اگر راز تقدیر آشکار ہو جائے تو تدبیر انسانی کی تمام دل آویزیاں اور حیات کی تمام سرگرمیاں رکھی رہ جائیں۔

تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی ۔۔۔ جب میں نے دعا کا رُخ سوئے فلک دیکھا

یعنی کھل گیا کہ تدبیر کی تگ و دو تقدیر کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی۔

واسطہ جس کو نہ ہو تقدیر سے ۔۔۔ کام اب اس تدبیر پر ہے منحصر

ظاہر ہے کہ نہ ایسی تدبیر میسر ہوگی نہ کام بن پڑے گا۔

زخم دل اے چارہ گر قائل نہیں تدبیر کے ۔۔۔ سعئ درماں بے اثر۔ فکر دوا بے فائدہ

ہم نہیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے ۔۔۔ یاس کے آتے ہی ارماں دل سے یہ کہکر چلے

اس غزل کا مقطع سنئے۔ بے پناہ شعر ہے۔

اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے ۔۔۔ دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو

چند شعر اور اس دعوے کی تائید میں سنیئے :-

۱؎ حسرت کا شعر ہے۔ منزل وصال یار ہے پیدا ۔۔۔ درمیان حدود بیم و رجا

کر مری توبہ کو مقبول شکست توبہ — میری تدبیر میں تقدیر کی افتاد ہے

غم نصیبوں میں ہو فانی غم دنیا ہو کہ عشق — دل کی تقدیر سے تدبیر بدل جاتی ہے

مجبور شکایت ہوں نا تیر کو کیا کہیے — تدبیر مقدر تھی۔ تقدیر کو کیا کہیے[1]

اسی کے ساتھ جبر و اختیار پر فانی نے جو ندرت آفریں اور دل نشیں خیالات پیش کئے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کی نازک پرواز طبیعت نے اس خشک مبحث کو کس قدر نازک پہلو پیدا کئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر شعر شعریت سے بھرپور ہے۔

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

زید کے سامنے شراب اور شربت لائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اختیار سے ان میں سے ایک (مثلاً شراب) کو پسند کر لیتا ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ نام نہاد اختیار بھی جبر کی ایک صورت ہے یعنی زید کی افتاد مزاج۔ ماحول کے محرکات نے اس کو مجبور کیا کہ وہ شربت کی جگہ شراب ہی کو قبول کرے۔ یہ بظاہر اختیار اور بباطن جبر کی کارفرمائی تھی مگر دیکھنے میں کوئی جبر نظر نہیں آتا۔ اسی لئے کہا ہے کہ اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں۔

محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا — آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

فانی داد اس لئے چاہتے ہیں کہ جبر دوست کا پردہ رکھنے کے لئے انھوں نے اختیار کی تہمت اپنے سر لے لی۔

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی — سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

---

[1] میر کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے خودمختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

جبر اس لئے کہ تمام امور علم الٰہی میں پہلے ہی طے ہو چکے ہیں۔ لیکن اختیار کا سانچا یعنی کسب انسانی بھی ساتھ ساتھ ہو۔ اور اسی بنا پر انسان کو مکلف ٹھرایا گیا ہے۔ اسی مضمون کو فانی نے دوسری جگہ بیان کیا ہے۔

وہ گھڑی ہوش میں آنے کی گنہگار ہیں ہم　　وہ ہی مختار سزا دے کہ جزا دے فانی

حقیقت تو یہ ہے کہ یہی ہوش یعنی کسب انسانی ہی اختیار کی علامت ہے۔
دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا　　امید عفو ہی ترے انصاف سے مجھے
یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہو　　کیا ہے خلق مجھے باوجود علم گناہ

مراد یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے گناہ کی تخلیق ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس نے انسان کے کسب پر پردہ ڈالا ہے۔

میر، غالب اور فانی

دورِ حاضر کے تقریباً تمام ناقدین نے فانی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی غزل سرائی کو سراہا ہے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:۔

"اگر کوئی غزل گو ہمارے سامنے زندگی کے مسائل۔ محبت کے مسائل ان کی پیچیدگیاں اور ان کے حل، پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی شاعری موجودہ دور کے لوگوں کے لئے بھی اپنے دامن میں کچھ بجلیاں رکھتی ہے۔ فانی کے یہاں ایسی بہت سی بجلیاں ہیں"[1]

آل احمد سرور لکھتے ہیں:۔

"یہ غلط ہے کہ ان کے اشعار زندگی سے زندگی کرنے کا حوصلہ چھین لیتے ہیں، وہ طبیعت میں ایک خاص گداز، نظر میں بصیرت اور احساس میں ایک خاص گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ زندگی میں ان چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔"[2]

میکش اکبرآبادی کا خیال ہے۔

"میری رائے میں فانی، نظیری نیشاپوری اور میر و غالب اکبرآبادی کا بہترین امتزاج ہیں"[3]

---

[1] تا [3] ان اقتباسات کے لئے ملاحظہ ہو علی گڑھ میگزین (فانی نمبر)

جگر مراد آبادی کی رائے ہے۔

"فانی اور ان کی شاعری اس وقت بھی ایک زندہ حقیقت ہے اور ہمیشہ زندہ حقیقت رہے گی اور نمائشی چیزوں سے اتنی بلند نظر آئے گی کہ ہر نئے سے نئے ادب کو اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا۔"[۱]

سیماب اکبر آبادی تحریر کرتے ہیں کہ

"کثرتِ مشق و مزاولت اور سیر حاصل مطالعے نے ان سے ایسے اشعار بھی کہلوائے ہیں، جو ادب اردو کے جواہر پارے اور تخیل کے شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ گو ایسے اشعار ان کے مجموعہ کلام میں کم ہیں مگر تب بھی وہ اتنے ہیں کہ ایک شاعر کی حیثیت سے فانی کو ہمیشہ باقی رکھنے کے لئے کافی ہیں۔"[۲]

فراق گورکھپوری :-

"فانی کی غزل وہ حسین کمزوریاں، وہ نازک بے بسی، وہ پُرخلوص و معصوم سعیٔ بے حاصل اپنے اندر رکھتی ہے کہ آج بھی، کل بھی، پرسوں بھی اور شاید دنیا کے بدل جانے پر بھی اس پر زندگی کے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی آنکھیں پڑتی رہیں گی اور کبھی کبھی اس طرف کان لگ جایا کریں گے۔"[۳]

مظفر احمد صدیقی :-

"شاعر کو شاعر کی زندگی کا آئینہ کہا جاتا ہے اور شعرا کے متعلق یہ نظریہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ لیکن فانی کی شاعری پر حرف بہ حرف پورا اترتا ہے۔"

---

[۱] تا [۳]۔ ان اقتباسات کے لئے ملاحظہ ہو علی گڈھ میگزین (فانی نمبر)

اسی کے ساتھ کتنی تنقید نگاروں نے ان کی شاعری کے آہنگ کو میر اور غالب سے قریب بتایا ہے۔ چناں چہ پروفیسر سرور ان کے کلام پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ لَے ان کو میر سے بہت قریب کر دیتی ہے۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ فانی غالب کی طرح حساس ہیں۔ مکیش صاحب کی رائے اور پروفیسر گندری مولانا حامد حسن قادری کا بھی یہی خیال ہے۔ سیماب صاحب نے بھی ان کے یہاں میر و غالب کے رنگ کا نمایاں ہونا بتایا ہے۔[1] لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان رایوں میں حقیقت کی ادھوری ترجمانی ہے۔ یہ درست ہے کہ فانی کی شاعری میں جو گداز اور ان کی فکر کا جو انداز ہے وہ ہمیں میر و غالب کی یاد دلاتا ہے۔ تاہم ان کا غم میر کے غم سے زیادہ لطیف، اور ان کی تخیل غالب کی تخیل سے زیادہ گہری ہے جیسا کہ آپ آیندہ سطروں میں ملاحظہ کریں گے۔ احتشام صاحب نے بڑی حد تک حقیقت کی ترجمانی کی ہے جہاں انھوں نے کہا ہے کہ :-

> "کہا جاتا ہے کہ فانی کے یہاں میر کے گداز اور غالب کے علو کا امتزاج ہے۔ ممکن ہے ایسا بھی ہو۔ لیکن فانی، میر اور غالب میں سے کسی سے قریب ہوں یا نہ ہوں۔ اپنی ذات سے بہت قریب تھے اور اسی کی ترجمانی نے ان کی شاعری میں اثر پیدا کر دیا ہے۔"[2]

یہ اپنی ذات سے قریب ہونا بہ یک وقت شاعر کی انفرادیت اور اس کے تجربات کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔

ہمارے ناقدوں کا پرانا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی شاعر یا ادیب پر تبصرہ کرنے بیٹھتے ہیں۔ تو اس کو بڑھانے اور اس کے ہم عصروں کو گھٹانے کی کوشش

---

[1] و [2]۔ ملاحظہ ہو علی گڑھ میگزین فانی نمبر

کرتے ہیں۔ موازنہ کا ایک غلط طریقہ یہ بھی ہے کہ بے ضرورت دو ہم عصر شاعروں
میں مطابقت پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ چناں چہ میر کا سودا سے۔ آتش
کا ناسخ سے۔ غالب کا ذوق سے موازنہ کرنے کا عام رواج ہے۔ حالانکہ فطرت شعر
کا نباض جانتا ہے کہ ان لوگوں کے رنگ جدا۔ انداز الگ۔ مزاج مختلف اور
ماحول شعری جداگانہ تھے۔ اگر موازنہ کی رسم کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے تو میر اور
فانی کا موازنہ بھی ممکن ہے۔ سوا صدی کے طویل وقفہ کے باوجود ایک دوسرے
سے قریب ہیں لیکن اس موازنہ سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ اس کی بنا پر کسی شاعر
کی تنقیص کی جائے۔ صرف مقصد یہ ہے کہ دونوں باکمال شاعروں کے یہاں غم کی
نوعیت کیا ہے؟ اور دونوں نے غم کے ساتھ اور غم نے ان دونوں کے ساتھ
کیا سلوک کیا؟ وہ کون سے خیالات اور تاثرات ہیں جن کی بنا پر ایک دوسرے
سے ہم آہنگ ہیں اور وہ کون سے محرکات ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتے
ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے۔

کس ماجرائے بلبل دیوانہ حل نہ کرد سرگشتہ ماند ہر کہ بہ ایں ماجرا رسید

فانی اور میر دونوں کو غم سے سابقہ رہا۔ مگر ایک دوسرے سے ہم آہنگ
نہیں ہیں۔ دونوں کے یہاں محرکات غم مختلف ہیں۔ دونوں کے حالات اور
ماحول جداگانہ تھے۔ جہاں دونوں میں یک گونہ مطابقت پائی جاتی ہے۔
وہاں بھی آرٹ کے اختلاف نے دونوں کو جدا کر دیا ہے۔ ہر بڑا شاعر ایک
خاص قسم کی انفرادیت کا حامل ہوا کرتا ہے اور یہی انفرادیت اس کے درجہ کا
تعین کرتی ہے۔

میر کا وہ زمانہ ہے جب دلی کی سیاسی فضا نادر شاہ اور احمد شاہ کے
حملوں سے گونج رہی تھی۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

یہ مریض ناتواں چند ہچکیوں میں روداد زندگی سنا کر ختم کرنے والا تھا۔ ظاہر میں مغلیہ سلطنت کا تاجدار شہنشاہ ہندوستان تھا مگر زندگی نے وہ دردناک منظر بھی دیکھا جب تاجدار ہند کے اقتدار کی حد صرف اندوتی تا پالم تھیں اور شہنشاہ کبھی مرہٹوں اور کبھی روہیلوں کے رحم و کرم پر تھا۔ معاشی۔ سیاسی مذہبی اور اخلاقی حالت دگرگوں تھی۔ زمانہ کا ہر لمحہ ایک عظیم الشان انقلاب کی خبر دے رہا تھا۔ طوائف الملوکی کی وجہ سے ہر شخص اپنی جگہ پریشان اور ہراساں تھا۔ جہاں عیش و عشرت کی گھما گھمی تھی۔ وہ محفلیں اُجڑ گئیں۔ میر کی زبان سے ذرا بربادی کی روداد سنیئے:۔

پیسے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر　　تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر　　بھیاں سی گریں ہزار فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

یہ وہ حالات ہیں جن میں میر جنم لیتے ہیں۔ کساد بازاری کا یہ عالم اور اس پر میر صاحب کا نازک دل۔ شیشہ پتھروں سے کیوں کر نباہ کر سکتا تھا۔ ٹوٹا اور اس طرح ٹوٹا کہ پھر درست نہ ہو سکا۔ قدرت نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ غم زدہ دل کو ابھی کچھ اور نشتر عطا کرنے تھے۔ غم دوراں کے ساتھ غم جاناں کا بھی روگ لگ گیا شاید زمانے کے تغیرات سے مصالحت بھی ہو جاتی مگر عشق و محبت کی ناکامی نے افسردہ چنگاریوں کو اور بھی مشتعل کر دیا۔ عزیزوں کی بے وفائی اس پر تازیانہ تھی۔ طبیعت درویشانہ تھی۔ زمانہ کی بے ثباتی اور تغافل کے باعث، دنیا کی ناپائیداری اور انسانوں سے بیزاری کے خیالات پیدا ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ میر کے یہاں مردم بیزاری، قناعت، جبر، غم پرستی اور قنوطیت پسندی، شاعری کے موضوعات کی حیثیت سے آئے۔ یہ ضرور ہے کہ جب ان کی ذاتی صلاحیت

بروئے کار آتی ہے تو وہ مردم بیزاری کے باوجود عظمت انسانی کے بھی مداح نظر آتے ہیں۔

فانی کے زمانہ میں طوائف الملوکی نہ تھی۔ زمانہ ایک متوازن اور ہموار راہ سے گذر رہا تھا اسی زمانہ میں نہ بیرونی حملوں کا ڈر تھا اور نہ اندرونی خلفشار کا خوف بلکہ قلوب کافی حد تک انگریزوں کی غلامی سے مطمئن ہو گئے تھے۔ سیاسی اور سماجی حالات ایسے نہ تھے جو ان کے یہاں کسی 'شہر آشوب' کو جنم دیتے۔ البتہ میر کی طرح فانی کو بھی احباب اور اہل وطن سے شکوہ رہا ہے۔ ان کے یہاں بھی کسی ناکام محبت کی خلش موجود ہے۔ ان کا غم ایک حد تک ذاتی ہے۔ ان کے غم کے تجربات عام سہی مگر ان کے پیرایۂ اظہار کو کبھی فانی نے عام نہ ہونے دیا۔ یہی سبب ہے کہ پڑھنے والا جو گداز میر کے غم میں پاتا ہے فانی کے غم میں نہیں پاتا۔ مگر ان نامرادیوں اور حرماں نصیبیوں کے باوجود فانی دیوار کے سائے میں 'دامن کو منھ پر لے کر سونے' کی تمنا نہیں کرتے۔ غالباً ان کی حرماں نصیبی میں اعتدال پیدا کرنے والی شے پہلے ان کا تصوف ہے جو عملی نہ ہونے کے باوجود نظری تو ہے اور دوسرے ان کے فلسفیانہ زاویہ نظر ہے جس نے ان کی فکر کو عزمیت اور ان کے غم کو رفعت بخشی ہے۔ اور غم کی یہی منزل ہے جہاں سے میر اور فانی کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔

میر اور فانی کے غم میں نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ جب غم و آلام کی افتاد میر پر پڑتی ہے تو وہ اس کو جس شدت سے محسوس کرتے ہیں اسی شدت کے ساتھ اظہار کر دیتے ہیں۔ وہ فانی کی طرح اس کے اسباب و علل پر سوچتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ جس سادگی اور روانی سے اپنے جذبات کا اظہار میر نے کیا وہ فانی کے یہاں نہیں ہے۔ صداقت دونوں کے یہاں ہے اور اسی عنصر نے

ان کے تجربات کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک کلام میں جذبات کا عامیانہ بے ساختہ اظہار ہے اور دوسرے کے جذبات پر فکر کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ میر کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ سے یہ عاشق — وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی
یہ کہہ کے میں رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر — سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
اس موج خیز دہر میں تو ہے حباب سا — آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہو خواب سا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اشعار نہ صرف میر کے بلکہ اردو شاعری کے نشتروں میں سے ہیں۔ مگر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غم و اندوہ کی وہی پرانی ڈگر ہے جس پر ہمیشہ شاعری کے کارواں چلتے رہے ہیں۔ میر کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے خلوص جذبات اور حسن ادا نے ان کو نئی زندگی بخشی مگر غم کو عرفان غم میں تبدیل کرنا صرف فانی کا حصہ ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ میر اور فانی کی زندگی اور شاعری میں کئی لحاظ سے مماثلت پائی جاتی ہے جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ دونوں کے زمانۂ وفات میں سو اصدی سے زیادہ کا فصل ہے۔ اس مدت میں کتنے خارجی اور داخلی عوامل بروئے کار آئے اور اردو شاعری کے ارتقا نے کتنی منزلیں طے کیں۔ یہ مسئلہ تاریخ کے ہر طالب علم سے غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اگر ہم میر اور فانی کے غم پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ میر کے یہاں غم کا ایک عامیانہ

تصور ہے۔ ان کے جذبات میں عدالت اور صداقت کے ساتھ اثر ضرور ہے لیکن رفعت نہیں۔ وہ درد و کرب سے چیخ پڑتے اور اپنے نالہ و آہ سے سننے والوں کو بے تاب کر دیتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں غم کا حکیمانہ تجزیہ، جو غم کو قدرت کا انعام اور اپنی دولت سمجھے اور اس کو محبوب جان کر اس کا خیر مقدم کرے، نہیں ملتا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی شاعری کو شاعری نہیں بلکہ درد و غم کی روداد قرار دیتے ہیں۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

ان کے درد و غم کی شدت دیکھنا ہے تو ذیل کی مثالوں پر نظر ڈالئے

بے دماغی، بے قراری، بے کسی، بے طاقتی
کیا جئیں وہ جن کے جی کو روگ یہ اکثر رہیں

یاد روئے یار لایا اپنی تو یوں ہی گذری
کیا ذکر ہم صفیراں یاران شادماں کا

اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن
وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں داغ ایک
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

داماں کوہ میں جو میں ڈاڑھ مار رو دیا
اک ابر واں سے اٹھ کر بے اختیار رو دیا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

دل ہم پہونچا بدن میں تب سے تن جلا
آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

میر کی استادی میں کوئی شبہ نہیں ان کے کلام میں بہتر نہیں اس سے کہیں

زیادہ نشتر نکل آئیں گے۔ اوپر دیئے ہوئے اشعار میں بھی متعدد شعر ان کی شاعرانہ عظمت کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن وہ ندرت، وہ لطافت اور وہ رفعت جو فانی کے یہاں ملتی ہے ان کے یہاں نہیں ہے۔ متقدمین سے لے کر عہد حاضر تک سیکڑوں شعرائے (بعض نے واقعی طور پر اور اکثر نے بہ تکلف) درد و غم کی داستان دہرائی ہے۔ مگر اس ژرف نگاہی کی مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں اس کے لئے ایک حساس دل اور ایک فلسفیانہ نظر کی ضرورت ہے۔ اگر ایک وصف ہے مگر دوسرا نہیں تو شعر یا تو عامیانہ ہو کر رہ جائے گا یا خشک ہاں جب دونوں کا امتزاج ہوگا تو شعر میں رفعت اور شعریت پیدا ہو جائے گی۔ آئیے غم کے موضوع پر فانی کی نکتہ سنجیاں ملاحظہ کیجئے۔ لوگ عشرت روزہ روزہ یا حسرت دیروزہ پر جان دیتے ہیں ان کو کیا معلوم کہ یہ غم ہی کے ارتقا کی ابتدائی منزلیں ہیں۔

یا عشرت روزہ روزہ تھا یا حسرت دیروز   وہ لمحۂ ہستی جو ابھی غم نہ ہوا تھا

رنج زیست کو بھی کرم سے تعبیر کرتے ہیں مگر ان کی ہمت عالی اس پر قانع نہیں اور رنج جاودان کی طالب ہے۔

تو نے کرم کیا تو بعنوان رنج زیست   غم بھی مجھے دیا تو غم جاودان نہ تھا

اسی مضمون کو دوسری جگہ باندھا ہے:۔

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں   مجھے یہ غم کہ غم جاودان نہیں ملتا

غم سے اگر کوئی شخص بیزار ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو مصلحت ایزدی پر اعتراض ہے۔

زہے تقدیر ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھہری   تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

دراصل راضی برضا رہنے والوں کی یہی شان ہو۔ یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک

غم خدا کا کرم ہے جو ہر کسی کے حصہ میں نہیں آتا

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم میرا
مگر من جملۂ آداب غم خواری ہے غم میرا

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو — میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

دل اور غم اصل میں دو حقیقتیں نہیں۔ بلکہ ایک ہی حقیقت ہے جس کے دو نام ہیں۔ دل غم سے خالی رہے یہ غیر ممکن ہے۔

جلوۂ آتش نہاں جسے غم کہتے ہیں — دل ہوا جس کے وہی شعلۂ عریاں میرا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں — رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

دل تو سب کو تری سرکار سے مل جاتے ہیں
ورد جب تک نہ ملے دل نہیں ہونے پاتے

فانی کا جنون عشق در و دیوار کے علائق سے بے نیاز ہے۔

اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یارب — در و دیوار دیے اب انہیں ویرانی دے

وہ تقدیر کے شکر گزار ہیں جس نے ان کی محنت بچادی اور گھر کو ویرانی بخشی

گھر خیر سے تقدیر نے ویرانہ بنایا — سامان جنوں مجھ سے فراہم نہ ہوا تھا

غم یا درد کی عظمت کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کی دین ہمارے ظرف سے کہیں افزوں تر ہوتی ہے۔ مجھی کو دیکھو کہ میرے دل کی کیا بساط تھی۔ لیکن منعم حقیقی نے اس کو درد کی اتھاہ دولت بخش دی۔

خدا کی دین نہیں ظرف خلق پر موقوف — یہ دل بھی کیا ہے جسے درد کا خزانہ ملا

غم ہی جی کا دشمن تھا غم سے دور رہتے تھے — غم ہی رہ گیا آخر ایک غم گسار اپنا

دم بھی فانی کسی کے غم تک ہے　　دم نہ ہوگا اگر یہ غم نہ ہوا

جو محبوب کے جلوے سے اگر ایک لمحہ ہی کے لئے بہرہ یاب ہوتے ہیں وہی اس دولت کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔

فیض یک لمحۂ دیدار سلامت فانی　　غم ہر روز ہے بڑھتی ہوئی دولت میری

یوں تو دل کی کچھ ایسی بساط نہ تھی مگر اسی غم کی بدولت اب اس کا یہ مرتبہ ہو گیا کہ خود غم دوست اس کا احترام کرتا ہے۔

جبیں دردہو بےتاب سجدہ لے فانی　　کدھر ہے خاک ترے دل کے آستانے کی

زندگی یاد دوست سے عبارت ہے اور یاد دوست فانی کے نقطۂ نظر سے غم کا دوسرا نام ہے۔

زندگی یاد دوست ہے یعنی　　زندگی ہو تو غم میں گذرے گی

اس کے ہوتے ہوئے وہ نشاط وصل کے بھی طالب نہیں۔

دل کو یاد نشاط وصل نہ چھیڑ　　غم میں گذری ہو غم میں گذرے گی

دل اور ہوائے سلسلہ جنبانیٔ نشاط　　کیوں پاس وضع غم تجھے غیرت نہیں رہی

غم کی اس لذت کوشی نے موت کو شاعر کے لئے ایک دل پسند اور محبوب چیز بنا دیا ہے کیوں کہ اس کی بدولت راہ کے کانٹوں سے بچ کر گل مراد دوست تک رسائی ممکن ہے۔ موت دنیا والوں کے لئے بھیانک ہو تو ہو ان کے لئے ایک عروس زیبا سے کم نہیں۔ قاعدہ ہے کہ محبوب تک پہونچنے کا وسیلہ بھی محبوب ہو جاتا ہے۔

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے　　مری قضا کو وہ لائے دلھن بنائے ہوئے

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت　　یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

ایسے نازک اور دلکش نشتر فانی کے یہاں بکثرت ہیں۔ شاعر نے زندگی سے خفا ہوکر موت کو اپنی زندگی قرار دے لیا ہے مگر زندگی سے (برائے نام ہی سہی) اتنا ربط بھی گوارا نہیں۔ یا تو خود خلش پیدا ہوئی یا کسی دل جلے نے طعنہ دیا کہ زندگی سے یہ علاقہ بھی کیوں۔ اس کا معاً جواب دیتا ہے۔ کہ

"آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت"

یہ خیال پوری اردو شاعری میں شاید ہی کسی کے یہاں نظر آئے اس پر قدرت زبان کا یہ عالم کہ فصاحت قربان ہوئی جاتی ہے "یہ تو ہوا" یعنی اس حد تک تو کامیابی ہوگئی "آتی رہے گی خیر" یعنی پوری امید ہے۔ ایسی کیا جلدی پڑی ہے جو شخص زندگی کو شب فرقت کی طرح ناگوار سمجھتا ہو وہی کہہ سکتا ہے۔

شب فرقت کٹی یا عمر فانی — اجل کے ساتھ آمد ہے سحر کی

جب دیکھئے جی رہا ہے فانی — اللہ رے اس کی سخت جانی

آج روز وصال فانی ہے — موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

مرگ فانی میں اب تو دیر نہ کر — سہل فرمانے والے مشکل کے

لذت فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی — دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے

فانی دعائے مرگ کی تکرار کیا ضرور — غافل نہیں کہ ان سے تقاضا کرے کوئی

خدا چاہے تو مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ فانی کی قوت یقین کو اس کے ماننے میں کوئی تذبذب نہیں۔ وہ کہتا ہے۔ تجدید زندگی تو محالات سے نہیں البتہ اسکو یہ خیال ضرور آتا ہے کہ کہ

"فانی مگر یہ ان کی مروت سے دور ہے"

موشگافی کرنے والے حضرات اس میں کہیں انکار حشر کا پہلو نہ ڈھونڈیں۔ شاعر اس عالم کی زندگی کا طالب نہیں ورنہ اس عالم کی زندگی ایک عاشق کو کیوں

ناپسند ہونے لگی۔ اس کی نگاہ میں تو موت کا دن روز وصال کا نام ہے۔

ہر شخص کلام فانی کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ ان کے یہاں غم کا مفہوم میر کے غم سے کہیں لطیف اور دقیق ہے اور ان کی شاعری میں موت کا بیان ایک زمانے کے لکھنؤ کے میت اور کفن سے بہت بلند اور ارفع ہے۔ یہ سچ ہے کہ ابتدائی دور میں لکھنؤ کے قیام کے اثر سے وہ بھی اس رنگ کی طرف مائل ہوئے تھے۔ مگر شکر ہے کہ جلد کنارہ کش ہو گئے ورنہ اردو ایک انفرادیت پسند شاعر کی زندہ جاوید تخلیقات سے محروم رہ جاتی۔

اب پھر ہم میر اور فانی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہماری قطعی رائے ہے کہ میر کے غم میں شدت ہے اور فانی کے غم میں لطافت۔ وہ سادگی کے خوگر ہیں یہ دقیقہ سنجی کے۔ ان کے یہاں بھی صداقت ہے اور ان کے یہاں بھی۔ وہ بے ساختہ کراہ کے عادی ہیں یہ ضبط آہ کے۔ وہ درد سے بے قرار ہیں اور یہ درد کے لئے بے قرار۔ اب سوال یہ ہے کہ فانی نے غم کو کیوں اپنایا۔ ان کو یہ سوز خوانی کیوں پسند آئی۔ انھوں نے زندگی کا متنائم پہلو کیوں اختیار کیا۔ اس کے جواب کے لئے ذیل کے حقائق کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں کسی فطری شاعری کو کسی خاص موضوع یا اسلوب کا پابند کرنا کیوں کر روا ہے۔ یہ اعتراض اگر بجا ہے تو ہر شاعر پر کم و بیش یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ میر پر جنھوں نے بقول خود کتنے ہی درد و غم جمع کئے تب دیوان وجود میں آیا۔ فردوسی پر کہ انھوں نے رزم کو اپنایا سعدی نے اخلاقیات کو، حافظ نے سرمستی کو۔ غالب نے فلسفیانہ فکر کو۔ مومن نے تغزل کو۔ داغ نے محبوب سے چھیڑ چھاڑ کو۔ ریاض نے خمریات کو۔ اصغر نے نشاط کو، اپنے موضوع شعر کی حیثیت سے کیوں انتخاب کیا۔ اصل

یہ ہے کہ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ شاعر ایک انسان اور حساس انسان
ہے اور انسان کا اپنے دورِ حیات میں سیکڑوں داخلی اور خارجی عوامل سے
متاثر ہونا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ البتہ ایک اچھا شاعر اپنے محسوسات کو ایسے
خاص انداز میں پیش کر دیتا ہے کہ سننے والے دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔
ان کے یہاں شاعری کے علاوہ ورائے شاعری ایک ایسی چیز بھی ہوتی
ہے جو اس کی انفرادیت کی ضامن کہی جاسکتی ہے۔ خواہ آپ اسکی شعریت
کے نام سے یاد کریں یا اثر کے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے بغیر شعر
صحیح معنی میں شعر نہیں کہا جاسکتا۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے کہ :۔

محبت ہو کسی سے یا عداوت   مزا دے جائے گی جو دل سے ہوگی

دوسرے یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ غم کوئی عیب نہیں۔ اس کا بھی انسانی
زندگی میں ایک مقام ہے۔ وہ ایک ایسا محرک ہے جو انسان کی طبیعت میں
گداز۔ نگاہ میں بصیرت اور جذبات میں پاکیزگی کا ذمہ دار ہے۔ مسعود حسن رضوی
کا غم کے بارے میں خیال ہے۔

"اب رہا غم تو وہ شاعری کے لئے خوشی سے کہیں بہتر موضوع ہے
اس لئے کہ خوشی انسان کے پست جذبات کو متحرک کرتی ہے اور
غم بلند ترین حیات کو بیدار کرتا ہے۔ کامیڈی کے مقابلے میں
ٹریجیڈی کی افضلیت کا راز یہی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غم
کے جذبات میں وہ زور ہوتا ہے کہ شاعر ان کے اظہار پر مجبور
ہوتا ہے۔ خوشی میں یہ طاقت کہاں[۱]"

کوئی بات تو تھی جب شیلی نے کہا تھا۔

---

[۱] ہماری شاعری پروفیسر مسعود حسن رضوی

OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE WHICH
TELL OF SADDEST THOUGHTS

بہت سے سالکانِ طریق کو عرفان کی منزل غم ہی کی راہ سے ملی ہے۔ بقول حضرت رضی بدایونی:

لائی ناکامیٔ دل منزلِ جاناں کے قریب
اس کے جلوے تھے سراپردۂ حرماں کے قریب

اس سے قطع نظر فانی کی شخصی زندگی جوانی سے تا آخر عمر درد و غم کا مرقع تھی بلکہ کہنا چاہیئے کہ درد و غم ہی ان کی زندگی بن گئے تھے۔ عشق کی ناکامی۔ ماحول کی بے مہری۔ وطن کے مصائب۔ غربت کے شدائد نے ان کو پیکرِ الم بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ غم ان کا رفیق اور موت ان کا سہارا بن کر رہ گئی۔ ان حالات میں ان سے غم کی آہ کی جگہ طرب کے قہقہے کی امید رکھنا دائرے کو مربع میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ فانی کی سحر طرازی نے غم کو مرغوب اور موت کو محبوب بنا دیا۔ اور ان کی تلخی اور دہشت انگیزی ان سے چھین لی۔ پھر ایسا نہیں کہ یہ امور محض برائے گفتنی ہوں۔ یہ سب فانی کے دل کی آواز تھی ان کی شاعری کو کسی شاعر نے روایتی نہیں کہا ہے ان کی شاعری حقیقی ہے اور ان کی زندگی سے ہم آہنگ۔

اہلِ دنیا مجھے سمجھ لیں گے
دل کسی دن ذرا لہو تو کریں

اب رہا یہ امر کہ آیا جو کچھ انہوں نے کہا وہ سلیقہ سے کہا اور ان کا بیانِ غم شعریت سے بھرپور ہے یا اس کے برخلاف خشک اور سپاٹ۔ اس کی نسبت فانی کے مندرجہ بالا اشعار اور ان کی تشریح پر ایک بار پھر نظر ڈالیے تو آپ تسلیم کریں گے کہ فارسی غزل میں معدودے چند کو چھوڑ کر اور اُردو غزل کے تمام سرمائے میں فانی کی شاعری نے اپنے لئے سب سے اونچا مقام حاصل کر لیا

ہے۔ اور چوں کہ اب یہ جنس بازار سے ناپید ہو گئی ہے اس لئے آئندہ بھی ان کی انفرادیت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تعجب ہوتا ہے جب بعض نقاد کہتے ہیں کہ فانی زندگی سے فرار سکھاتے ہیں۔ ان کی دنیا تنگ ہے اور ان کی شاعری میں ایک تھکا دینے والی یکسانیت پیدا ہو گئی ہے۔ دراصل یہ وہی دل کے لہو نہ کرنے کی بات ہے۔ ان کے نزدیک شعر کسی خاص مقصد کے تحت وجود میں نہیں آتا وہ خود اپنا مقصد ہے۔ انھوں نے ایک تقریر میں کہا تھا۔

"شعر کے لئے پہلی اور آخری شرط شعریت ہے۔ یہ دل سے نکل کر دل سے ٹکراتی ہے"

اگر یہ مقصد حاصل ہو گیا تو پھر کسی دوسرے مقصد کی تلاش بے سود ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اقبال کے قائل نہ تھے خود اقبال نے بھی اس زاویہ نظر کو جو فانی کے یہاں ملتا ہے پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ وہ نقطہ ہے جہاں ہمارے یہ دو بڑے باکمال شاعر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اور دونوں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ دونوں میں ہر ایک خلوص جذبات۔ رفعت فکر اور کمال فن کی دولت سے مالا مال ہے۔ دونوں نے اپنا دل لہو کیا تھا۔ ایک نے اس لئے کہ اس لہو سے خود اپنا رنگ رخ تازہ ہو اور دوسرے نے اس غرض سے کہ وہ اس کی ملت کے ناموس کے چہرے کا غازہ ہو۔

اور یہ جو بحث گذری اس کو بظاہر تو میر اور فانی کا موازنہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں کی خوبیاں اور خامیاں دکھائی گئی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ موازنہ نہیں ہے کیوں کہ موازنہ میں اکثر اوصاف میں اشتراک پایا جانا ضروری ہے۔ اور یہاں اشتراک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں کاملین فن کے درمیان سوا صدی سے زیادہ کا فرق نمایاں ہے۔ زمانے کے تجربات۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات۔ ماحول

اور طبیعت کے گوناگوں اثرات کا فرق نمایاں ہے۔ زمانے کے تجربات۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات۔ ماحول اور طبیعت کے گوناگوں اثرات کا فرق معمولی نہیں ہے۔ یہ در اصل ایک آئینہ ہے جس میں دو بڑے شاعروں کے خط و خال جیسے نظر آئے ویسے دکھانے کی کوشش کی ہے۔

غالب کی شاعری اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تقریباً تمام ناقدین نے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے ان کو یہ مقام بخشا۔ فکر۔ جذبہ۔ واردات قلب کی مصوری۔ طرز بیان کی ندرت۔ حقائق کائنات کا مطالعہ۔ بدلتے ہوئے سماج کا شعور۔ اپنے ماحول کا تجزیہ۔ یوں تو ان تمام خصوصیات کا غالب کو غالب بنانے میں کم و بیش دخل ہے۔ مگر ہمارے نزدیک ان کی فکر کو ان سب پر تفوق حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک جاگیردارانہ نظام کے زوال آمادہ دور کی پیداوار تھے جس کا ظاہر کبھی پرسکون اور کبھی متلاطم رہتا تھا۔ لیکن اس کے باطن میں سیکڑوں طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ یہ درست ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں اس نظام کی بساط الٹی تو ان کو چنداں حیرت نہ ہوئی۔ اور ملال بھی ہوا تو ہندوستانیوں اور انگریزوں میں سے اپنے ذاتی دوستوں کی ہلاکت اور بربادی کا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنے سفر کلکتہ میں انگریزی طرز زندگی کی جھلک دیکھ آئے تھے۔ جس کی تعریف میں وہ آخر تک رطب اللسان رہے مگر یہ تو مظاہر و مناظر تھے جن سے تھوڑا بہت ہر شخص اپنی جگہ متاثر ہوا ہوگا۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان حقایق کا نہ صرف ادراک کیا بلکہ ان کو اپنی فکر کا جزو بنالیا۔ ان کے عمل اور رد عمل سے ان کے خیال میں گہرائی اور ان کے جذبات میں توانائی آئی۔ اور ان پر

غالب کی فکر رسا کی چھاپ ہے۔ وہ ماحول کے ساتھ سوچنے پر قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ ماحول کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں اس لئے نہیں کہتے کہ سننے والے سنیں اور سر دھنیں وہ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کی فطرت شعر کے روپ میں برانگندہ نقاب ہونا چاہتی ہے۔ اسی کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی فکر پر تصوف کا بھی خاصا اثر ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ دہلی کے ماحول اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صحبت نے ان کو صوفی مزاج بنا دیا۔ دوسروں کا بیان ہے کہ ان کے ذاتی مطالعے نے ان کو اس راہ پر لگا دیا۔ بنیاد جو کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ شیعت کے باوجود تصوف سے سرشار تھے۔ وہ عملاً صوفی نہ سہی مگر ان کے یہاں تصوف دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ اعتقاداً بھی تصوف کے قائل نہیں ہیں ان کے یہاں تصوف کا رنگ اس حد تک رچا بسا ہوا ہے کہ کہیں پر اجنبی نہیں معلوم ہوتے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"یہاں لاموجود الا اللہ کے بادہ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں ——— کجا غیر و کو، غیر و کو، نقش غیر ——— سوائے اللہ و اللہ باقی الوجود"

تصوف اور فلسفہ کا رشتہ بہت قریب کا ہے۔ علامہ شبلی کہتے ہیں :-

"فلسفہ جو شاعری میں تصوف کی راہ سے آیا۔ جب ہستی مطلق وحدت الوجود۔ فنا۔ بقا وغیرہ مسائل اسی تصوف کی بدولت آشنا ہوئے تو چونکہ دلچسپ مسائل سے تمام طبیعتوں کو ان میں

مزہ آتا تھا۔ لیکن ہر شخص صاحب حال نہیں ہو سکتا تھا اس لئے
جو لوگ معاشقہ اور حال کے زباں آموز تھے فلسفہ کا سہارا پکڑتے
تھے۔ اور اسی کے سکھائے ہوئے الفاظ بولتے تھے، یہ لے
بڑھتے بڑھتے پورا فلسفہ زبان میں آگیا[1]۔"

غالب کو صاحب حال کہنا تو ممکن نہیں لیکن صاحب قال ضرور کہا جا سکتا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ وہ فلسفی شاعر تھے یا نہیں۔ اس بارے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب ہم انھیں فلسفی کہتے ہیں تو ہماری یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ وہ کسی خاص نظام فکر یا فلسفیانہ سلسلہ کے بانی تھے جس کے محور کے گرد ان کی تخلیقات گھومتی ہیں بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ حقائق زندگی پر سنجیدگی سے سوچنے اور ان کو سلیقہ سے بیان کرنے کے خوگر تھے۔ یہ ہے غالب کی فکر کا ایک اجمالی خاکہ جس سے زیادہ کی ہمیں ان سے توقع کرنا درست نہ ہوگا۔ جب ہم فانی کے کلام کو غور سے پڑھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان کی گرفت فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل پر زیادہ محکم اور قوی ہے۔ بلکہ ان کے یہاں ان مسائل کے بیان میں شعریت بھی زیادہ دل کش اور جاذب توجہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کی فکر غالب سے زیادہ گہری اور پیچیدہ نظر آتی ہے۔

فانی قدرت سے ایک سوچنے والا دماغ اور ایک حساس دل لے کر آئے تھے۔ ان کو فلسفے سے خاصی مناسبت تھی اور جہاں تک ہمیں معلوم ہو انھوں نے فلسفہ کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ وہ نسلاً پٹھان تھے اور ان کے خاندان کا شمار شہر کے معزز خاندانوں میں تھا۔ مگر فانی کو جوانی ہی میں زندگی کے نشیب و فراز

---

[1] شعرالعجم جلد پنجم

دوستوں کی بے مہری اور محبت کی ناکامی سے کام پڑا۔ ان عوامل کا ردِعمل عموماً انسانوں کے طبائع پر مختلف وسائل و مسائل کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتا ہے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے احساس پر واقعات و حالات تازیانے کا کام کرتے ہیں۔ دوسرے گروہ میں بھی بعض طبیعتیں عمل کا سہارا لیتی ہیں اور نتیجہ کچھ بھی ہو سعی سے کنارہ نہیں کرتیں۔ ؎

کارِ من بہ دریا دروست و پا زدن تنہا

لیکن ان کے برخلاف کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں کہ سراپا احساس ہونے کے باوجود زندگی سے مصلح کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ زمانے کی بے مہری اور اہلِ زمانہ کی ناقدری ان کو ان کے بلند نصب العین سے تجاوز کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ فانی کا شمار اس آخری گروہ میں ہے۔ اسی کے ساتھ ان میں خودداری آزادہ روی۔ عالی ظرفی اور راست بازی کے اوصاف ایسے راسخ تھے کہ اس کی مثال انشائے عصر میں مشکل سے ملے گی۔ یہی وہ محرکات تھے جنھوں نے ان کی سیرت کی تشکیل میں حصہ لیا یا ان کی فطرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا۔ یہی فطرت ان کی تخلیقات کا خمیر ہے کیوں کہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ ان کی زندگی ان کی شاعری ہے اور شاعری ان کی زندگی سے الگ نہیں ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھانا قطعاً بے محل ہے کہ ان کی شاعری عمل سے بیگانہ کر دیتی اور زندگی سے فرار سکھاتی ہے۔ کیوں کہ ہم فانی پر ایک شاعر کی حیثیت سے بحث کر رہے ہیں نہ کہ ایک مصلح کی حیثیت سے۔

اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ فانی اور غالب کی فکر کا ایک حد تک موازنہ کیا جائے۔ اس کے لئے ایسے اشعار کو منتخب کرنا زیادہ دلچسپی کا موجب ہوگا جن میں فانی نے بالقصد غالب کے شعر کو سامنے رکھ کر اس سے ہٹ کر اپنے

لئے سجدا راہ نکالی ہے یا غالب کے خیال پر اضافہ و ترقی کی کوشش کی ہے۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں
(غالب)

عشق و عاشقی کا عام مضمون ہے جس میں عاشق نے رشک کے جذبے سے متاثر ہو کر تمنا کی ہے کہ کاش وہ معشوق کی گلی سے واقف ہی نہ ہوتا جس کی بدولت اس کی تلاش میں رقیب کے گھر جانا پڑا۔ اس موضوع پر مومن کا شعر ہے۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ایک طرف محبوب کے نقش پا کے احترام میں یہ مبالغہ۔ دوسری طرف اپنی ذلت کے احساس کی یہ شدت اس کے برخلاف فانی کے شعر میں ایک عارفانہ اور دقیق مضمون پیش کیا گیا ہے۔

ہر نقش پا کو دیکھ کے دھنتا ہوں سر کو میں پہچانتا نہیں ہوں تری رہ گذر کو میں

در اصل یہ وہ کیفیت ہے جو ہر سالک کو ابتدائے سلوک میں پیش آتی ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ روح اپنے مرکز اعلی سے چھوٹ کر اسی (مرکز اصلی) کی جستجو میں گم سفر ہوتی ہے۔ لیکن اثنائے راہ میں یہ دھوکا پیش آتا ہے کہ غلطی سے ہر عکس کو جلوہ سمجھ کر ٹھٹھک جاتی ہے۔ ع

ہر نقش پا کو دیکھ کے دھنتا ہوں سر کو میں

مرزا غالب کے یہاں رشک کے مضامین جس ندرت کے ساتھ ادا کئے گئے ہیں اس کی مثال کم شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ رشک کا یہ مضمون بھی خوب ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

غالب رشک کی وجہ سے محبوب کے گھر کا نام نہیں لیتے اور عالم اضطراب میں ہر ایک سے پوچھتے ہیں کہ "جاؤں کدھر کو میں"۔ لیکن فانی نے اسی مضمون کو زیادہ نزاکت سے پیش کیا ہے۔

نہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو   پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

غالب رشک کی وجہ سے محبوب کے گھر کا نام نہیں لیتے اور عالم اضطراب میں ہر ایک سے پوچھتے ہیں کہ "جاؤں کدھر کو میں" لیکن فانی کو راہِ طلب میں حضرت خضر سے بھی پوچھنا گوارا نہیں۔ اس کے علاوہ فانی نے پائے شوق کو جہت آشنا نہ ہونے کا ذکر کر کے سرے سے اس کی گنجائش ہی نہیں رکھی کہ کسی سے راستہ دریافت کیا جائے۔

غالب :- لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے   یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

شعر کی خوبی یہ ہے کہ عاشق نے جس کی خاطر گھر لٹا دیا ہے وہی اس کو بے ننگ و نام ہونے کا طعنہ دے رہا ہے۔ مگر

تم جو ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

مگر یہاں گھر لٹانے کی وجہ بیان نہیں کی گئی ہے تاہم شعر اپنی جگہ لطف سے خالی نہیں۔ فانی دیوانگی کے عالم میں گھر کو آگ لگاتے ہیں اور اپنے زعم میں یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ذرا دل بہل جائے گا اور ساتھ ہی تھوڑی دیر کے لئے سیاہ خانہ روشن ہو جائے گا۔ مگر افسوس ایسا نہیں ہوتا تو وہ بے ساختہ چیخ اُٹھتے ہیں۔

بہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی   یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

یہ مدِ نظر رہے کہ ذرا دیر کے لئے اُجالا ہونے کے بعد جو اندھیرا چھا جاتا ہے وہ مزید وحشت کا سبب ہوتا ہے اور روشنی کے تضاد میں یہ تاریکی زیادہ بھیانک معلوم ہوتی ہے

غالب :-

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی   ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

غالب نے بات وہی کہی ہے جو انیس انتہائی سادگی و بے تکلفی کے ساتھ کہہ گئے ہیں۔ کہ

آنا مرا دلیل جانے کی ہے

یہ حقیقت ہے کہ غالب کا انداز فکر اور طرز بیان نہایت سنجیدہ اور خیال انگیز THOUGHT PROVOKING ہے مگر شعریت کی کمی ہے۔ غزل کا ہلکا پھلکا پن اس گرانی کا متحمل نہیں۔ فانی نے یہی مضمون زیادہ شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے۔

تعمیر آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق — جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

غالب :-

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم — میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

فانی :-

اک کفر سراپا نے کیا حشر کا قائل — میں معتقدِ حشر مجسم نہ ہوا تھا

دونوں نے بظاہر ایک ہی بات کہی ہے اور دونوں نے محبوب کے فتنہ خرامی کا ذکر چھیڑ کر مرئی حقیقت سے غیر مرئی حقیقت تک لے جانے کی کوشش کی ہے لیکن یہاں بھی فانی کے خیال میں ترقی نظر آتی ہے۔ غالب قدِ یار کو دیکھ کر فتنۂ محشر کے قائل ہو جاتے ہیں جو قدِ یار کی شکل یا اس سے فتنہ خیزی میں بڑھا ہوا ہے لیا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ فانی معشوق کو حشر سے بڑھ کر فتنہ خیز قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ حشر تو صرف حشر ہے اور محبوب حشر مجسم ہے۔ جب حشر مجسم کا وجود آنکھ سے دیکھ لیا تو محض حشر کا وجود پہلے ثابت ہو جاتا ہے۔ فانی کا شعر منطقی حیثیت سے زیادہ مستحکم ہے، اگرچہ شعر میں ادعائے محض ہے۔ تاہم غزل کی شاعری میں ادعا کے بغیر کام نہیں چلتا فانی کے یہاں "کفر سراپا" کا ٹکڑا معنی خیز ہونے کے ساتھ نہایت بے ساختہ ہے جو ان کی قدرت زبان کی دلیل ہے لطف یہ ہے کہ حشر کا اعتقاد ایمان کی علامت ہے۔ مگر یہاں اک "کفر سراپا" ایمان کا سبب بن گیا۔

غالب :- ہے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

فانی :- ہائے وہ وعدۂ فردا کی مذدقت آخر — ہائے وہ مطلب دشوار کہ آساں نکلا

غالب فطرتاً مشکل پسند واقع ہوئے ہیں جس کا اقتضا یہ ہے کہ فنا یا ہستی کو مٹانے کی

عشق) جو دوسروں کے لئے نہایت دشوار ہے ان کو ابتدا ہی میں آسان معلوم ہوتی ہے اور اس بنا پر ان کی نظرت شکوہ سنج ہے۔ فانی کے شعر صوفیانہ نہیں بلکہ عاشقانہ مضمون ہے مگر نہایت پہلو دار اور پرلطف۔ معشوق کو وعدۂ فردا کرنا دشوار معلوم ہوتا تھا یہاں تک کہ عاشق کا آخر وقت آگیا۔ اب اس ظالم نے جانے کیا جاتی ہوئی دنیا دیکھی کہ وعدۂ فردا کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وعدۂ فردا کے بھروسے پر عاشق نے (خوشی کے مارے) جان دے دی۔ اس طرح وہ وعدۂ فردا جو محبوب کو دشوار معلوم ہوتا تھا بہت آسان نکلا۔ محبوب کے لئے یوں آسان کہ اس کو ایفا کے جھنجھٹ سے نجات ملی اور عاشق کے حق میں یوں کہ اس کی بدولت نزع کی مشکل سہل ہوگئی۔

جہاں غالب اور فانی نے تصوف کے میدان میں قدم رکھا ہے وہاں دونوں کی فکر کا فرق اور زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

غالب:- محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

فانی:- اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارۂ جمال منہ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا

دونوں باکمالوں نے دو مختلف حقیقتیں بیان کی ہیں۔ غالب کی مراد یہ ہے کہ جس کو دنیا والے حجاب کہتے ہیں وہ در اصل پردہ ساز ہے جس سے نغمہ ہائے راز نکل رہے ہیں یعنی اہلِ معرفت کے حق میں ہر چیز اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ فانی کہنا چاہتے ہیں کہ منظور سے الگ ناظر کی ہستی ہی کہاں ہو جو نظارہ جمال کی تہمت برداشت کی جاسکے۔ اس لئے لامحالہ تہمت سنتا ہوں اور حیران ہوکر جلوۂ نظارہ ساز کا منہ دیکھنے لگتا ہوں۔ انسان جب کسی کی زبان سے ایسی تہمت اپنے متعلق سنتا ہے جو بعید ہو تو حیران ہوکر تہمت لگانے والے کا منہ دیکھنے لگتا ہے۔ منہ دیکھنا کا استعمال کس قدر برمحل ہے اور جلوۂ نظارہ ساز کی ترکیب

بھی فانی کا حصہ ہے۔

غالب :- اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

فانی :- تعینات کی حد سے گذر رہی ہے نگاہ بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

غالب کا شعر سادہ ہے ان کے برخلاف فانی نے مگر

بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

کہہ کر شعر میں جو حسن اور زور پیدا کر دیا ہے وہ اُردو تو در کنار فارسی میں بھی مشکل سے ملے گا۔

غالب :- ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

فانی :- اللہ ری چشم ہوش کی کثرت پرستیاں ذرے ہی رہ گئے کوئی صحرا نہیں رہا

غالب کا مقصد یہ ہے کہ قطرہ و موج و حباب کوئی الگ ہستی نہیں رکھتے۔ یہ وجود بحر ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس جگہ بھی فانی کا انداز زیادہ دل کش اور شگفتہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کو اہلِ ظاہر کی "چشم ہوش" سے شکایت ہے کہ وہ کثرت پرستی میں مبتلا ہے اور اس کو ذرے ہی ذرے نظر آتے ہیں صحرا دکھائی نہیں دیتا وحدت الوجود فانی کا خاص مضمون ہے جس کے اظہار کے لئے انھوں نے نئے نئے پیرائے اختیار کئے ہیں۔

غالب :- ہے جب بہ جمالِ دل فروز صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

فانی :- کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

غالب :- دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

فانی :- عشق نا محرمِ راز ہے کثرتِ مجاز کا آئینے سے لگ گئے پرتوِ جمال میں

غالب :- ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فانی :- ہر جلوۂ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں
نظارہ نظر میں شامل ہے نظارے میں شامل کوئی نہیں

غالب :- گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھ سے آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

فانی :- حیرت نے مجھے تیرا آئینہ بنایا ہے اب تو مجھے دیکھا کر اے جلوۂ جانانہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے ہی اشعار فانی کے آیات کمال میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ اور انھیں کی بدولت ان کو ہماری زبان کے غزل نگاروں میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔

غالب :- دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوک ناز بے پناہ
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

فانی :- خود تجلّی کو نہیں اذن حضوری فانی آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

غالب :- دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

فانی :- تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا ہم تمھارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا

غالب :- تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا نشاں نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

فانی :- نشان مہر ہے ہر ذرہ ظرف مہر نہیں خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

اب ہم یہاں فانی کے چند ایسے خیالات نقل کرنا چاہتے ہیں جن سے غالب کا کلام خالی ہے۔ اور جن پر اول الذکر کی انفرادیت کو بجا طور پر دارومدار ہو۔ ممکن ہے کہ بعض طبائع فانی کی دقت پسندی اور موشگافی پر چیں بہ جبیں ہوں اور ان کے افکار کو عظمت کے منافی قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ افکار ہی ان کی عظمت کی روشن دلیل ہیں۔ ایک روایتی شاعر کے یہاں ان خیالات کی جھلک بھی ملنا مشکل ہے۔ جب تک کوئی شخص اپنی خودی میں ڈوب کر نہ اُبھرے۔ ذیل کی مثالوں سے ہمارے بیان کی بخوبی تصدیق ہو سکتی ہے۔

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی — وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا — یہ راز ہے کہ کوئی راز داں نہیں ملتا

میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا — اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہِ محبت میں قدم میرا

مفہوم کائنات تمہارے سوا نہیں — تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا

راز دل سے نہیں واقف دل ناداں میرا — تیرے عرفاں سے بھی دشوار ہے عرفاں میرا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری — ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

حاصل علم بشر جہل کا عرفاں ہونا — عمر بھر عقل سے سیکھا کیے ناداں ہونا

اک عالم دل ہے یہی دنیا یہی فردوس — ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی

یارب ترے لئے دل سے تو کان آشنا سے ہیں — آواز آ رہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر — نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

کس کو کہئے ماسوا جب تو نہیں تو کچھ نہیں — تو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا مجھے

صحرا کا اجتہاد ہے ذرے کی ہر نمود — ذرے کا اعتبار ہے صحرا کہیں جسے

پڑتا نہیں اس آئینے میں عکس کوئی اور — دل میں تری تصویر سی رکھ دی ہے کسی نے

مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں۔ تمام دیوان مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے دس پانچ اشعار بھی اگر کسی سے بن پڑیں تو اس کی شاعرانہ عظمت ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ غالب کی عظمت سے انکار نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ذہنی طور پر فانی نے غالب سے بہت کچھ استفادہ کیا ہوگا غالباً اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دور جدید میں غالب نے دو روپ اختیار کئے

ایک نے اصغر کی صورت اختیار کی اور دوسرے نے فانی کی۔ مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فانی کی شاعری کو غالب کی صدائے بازگشت ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ چراغ سے چراغ جلانے کی بات دوسری ہے ورنہ فانی نے غالب کے اثر سے آزاد ہو کر جہاں کسی خیال کو بھی پیش کیا ہے تو اس میں اس طرح اضافہ کر دیا کہ وہ فانی کا اپنا حصہ بن گیا۔ متاخرین شعرائے ایران و ہند میں بیدل کو چھوڑ کر دوسرے شعرائے فارسی کے یہاں یہ نزاکت خیال مشکل سے ملے گی۔ ہم نے یہاں موازنہ کرتے وقت فانی کے اس کلام کو قصداً پیش نہیں کیا جس میں انھوں نے اپنے محبوب موضوعات (غم۔ جبر و قدر۔ گناہ و عفو) پر قلم اٹھایا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ معاصرت حقیقت تک پہونچنے میں بڑی رکاوٹ ہوتی ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اگر ہم کسی چیز کو بالکل آنکھ سے ملا کر دیکھیں تو کسی صحیح نتیجے پر مشکل سے پہونچ سکیں گے۔ فانی کے معاملہ میں بھی یہی معاصرت سنگ راہ ہوئی ہے۔ کسی نے ان کو سوز خواں اور ہر وقت بسورنے والا ٹھہرایا۔ کسی نے ان کی شاعری کو بے کیف اور یک رنگی کا حامل بتایا۔ در اصل بات یہ ہے

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

بعض اصحاب نے فانی کے اشعار میں کچھ فنی خامیاں ڈھونڈھ نکالیں اور خیال کیا کہ تنقید کا حق ادا کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ یہ سب تصویر کے یک طرفہ ادھورے رُخ ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس باکمال شاعر کی حیات واردات اور معتقدات کے پس منظر میں اس کے افکار کا تجزیہ کیا جائے اور اس کے فن کا جائزہ لیا جائے جس سے اس کی تخلیقات کی نسبت ایک معتدل اور منصفانہ نظریہ قائم ہو سکے۔

فانی اور معترضین

میتھیو آرنلڈ کہتا ہے "تنقید اس بات کی بے غرض کوشش ہے کہ دنیا کی بہترین معلومات اور افکار سے واقفیت بہم پہونچے۔ ان کی اشاعت کی جائے تاکہ ہماری قوت متخیلہ اور تخلیقی صلاحیت کو سہارا ملے۔ جب ہماری نظر قدیم ناقدین پر پڑتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک صرف زبان و بیان کی صفائی ہی ادب و شعر کی روح ہیں۔ ان کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ شاعر یا ناثر کا مرکزی خیال کس چیز کا مطالبہ کر رہا ہے۔ وہ اس کی روح تک پہونچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ جدید نقاد اس کے برعکس نظر آتے ہیں۔ وہ شاعر یا ناثر کی روح تک پہونچنے کی کوشش میں زبان و انداز بیان کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ ان کو اس سے مطلق واسطہ نہیں کہ ادب میں جتنا مرکزی خیال کا حصہ ہے اسی قدر شعر کے سبھاؤ اور زبان کو بھی دخل ہے۔ اسی بے راہ روی کا اثر ہے کہ قدیم ناقدین کے نزدیک جان صاحب اور رنگین کی شاعری بھی ہماری زبان کا شاہ کار ہے اور جدید ناقدین کے خیال میں میرا جی اور راشد کی شاعری بھی ادب کا بیش بہا خزانہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر ناقدین ترقی پسندی کی آڑ لے کر ہر لغویت کو شاہ کار ادب نہ صرف خود مانتے ہیں بلکہ مصر ہوتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کے خیالات کی حمایت کریں۔ حالانکہ یہ امر بدیہی ہے کہ ایک نقاد کا غرض نہ صرف تقریظ ہے اور نہ تعریض۔ اس کا

غرض اول کلام کا تجزیہ (ANALYSIS) کرنا اور پھر فیصلہ (JUDGEMENT)
صادر کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ بغیر تجزیہ کے کسی قسم کا حکم صادر نہیں کیا جاسکتا
مگر اکثر نقاد ادب میں من مانی کرتے ہیں اور پھر اپنے نکالے ہوئے نتیجوں کو
صحیح سمجھ کر ان کی تبلیغ کرتے ہیں۔ والٹر پیٹر تو اس کے بھی مخالف ہے کہ نقاد
خود کوئی فیصلہ دے۔ اس کا خیال ہے کہ "پہلے شاعر کے محاسن کو محسوس کرنا اور پھر
اس کی تشریح و توضیح کرنا اور آخر میں فیصلہ لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ وہ خود
نتائج استنباط کریں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کوئی نقاد کسی تعصب (خواہ وہ سماجی ہو یا مذہبی
انفرادی ہو یا اجتماعی) کی بنا پر کسی کے کلام کا جائزہ لیتا ہے تو وہ منصب نقد سے گر
جاتا ہے۔ نقاد کا فرض ہے کہ شاعر یا ادیب کے محاسن و عیوب پر غیر جانبدارانہ نظر
ڈالے۔ محاسن کی تفصیل و تشریح کی طرف لوگوں کو متوجہ کرے۔ اس کے عیوب
کو ہمدردانہ جذبے کے ساتھ اس طرح دکھائے جیسے کوئی خیر خواہ اس کو بلند و
بالا اوصاف سے متصف دیکھنا چاہتا ہے۔ بے عیب ذات اللہ کی۔ شاعر ہو یا
ناثر۔ نقاد ہو یا معترض۔ ہر ایک میں کچھ خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ہونا لازمی
امر ہے۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ناقدین یہ امر بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ ناطقی
نے خود ایک جگہ فن نقد کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:-

"دنیا شاعری کے حقیقی مفہوم سے آج نہیں بلکہ کبھی آشنا نہیں
ہوئی۔ جب کوئی حقیقی شاعر دنیا کے سامنے آیا۔ دنیا نے اس کو
کبھی نہیں پہچانا۔ اس کی زندگی میں اس کے ساتھ دو طرح کا سلوک
ہوا۔ بعض نے اسے آدمی تو سمجھا مگر ذلیل و حقیر۔ اس لئے کہ اس کا
وجود دنیاوی اعتبار سے، مادی نقطۂ نظر سے بے کار محض تھا۔

بعض جنجوں نے اس کی بلندیٔ تخیل اور پرواز خیال کی اپنے نزدیک بہت کچھ قدر فرمائی اسے آدمی سے بالاتر سمجھا[1]۔"

فانی ان بد قسمت لوگوں میں تھے کہ ان کو ہمیشہ مورد تنقید بننا پڑا۔ ان کو کوئی حالی جیسا نقاد نہ ملا جو صحیح طور پر تنقید کا حق ادا کرتا نہ بجنوری جیسا تقریظ نگار ملا جو ان کے کمالات کو اجاگر کرتا۔ اس سے زیادہ اور کیا بدنصیبی ہوگی کہ فانی کے دوستوں نے بھی ان کو اچھے الفاظ سے یاد نہ کیا۔ فانی پر اعتراض کرنے والوں میں بیشتر وہ اصحاب ہیں جو ادب برائے زندگی کا نعرہ بلند کرتے ہیں یا وہ لوگ ہیں جو قریب ہونے کے باوجود فانی سے دور ہیں وہ ان کے کلام کو صرف یاسیات کا مرقع اور نوجوانوں کے مستقبل کے واسطے زہر قاتل خیال کرتے ہیں۔ فانی پر اعتراض کرنے والوں میں جوش ملیح آبادی۔ سیماب اکبر آبادی۔ عندلیب شادانی۔ سید حامد صبیح احمد کمالی اور مس تاج بیگم قابل ذکر ہیں۔

عام طور سے فانی کی شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں "ادب برائے زندگی کا تصور نہیں ہے۔ وہ زندگی کی اس شاہ راہ پر گامزن ہیں جہاں ہر چیز ان کو تصویر افسردگی نظر آتی ہے۔ ان کا درد و یاس نہ صرف شاعری بلکہ زندگی کے لئے سخت ہلاک ہے۔ ان کے یہاں قریاد زیادہ عرفان کم ہے[2]"

ادب برائے ادب ہو یا برائے زندگی جس میں حقیقت اور واقعیت نہ ہو وہ ادب زندگی سے ہم آہنگ ہے اور نہ اس کے تقاضوں کو اجاگر کر سکتا ہے ہمارے شعرا پر عام طور سے یہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ان کی زندگی عیش و عشرت میں گذرتی ہے مگر وہ غم فراق کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ سیاسی لیڈر ہی

---

[1] شعر و شاعری از فانی۔ سب رس۔ حیدر آباد

[2] ؍؍ سرار خ از سید حامد علی گڈھ میگزین۔ فانی نمبر ا

کے ساتھ نہیں بلکہ شاعر کے ساتھ بھی یہ حقیقت کارفرما نظر آئے گی کہ ع

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ

ان سب سے قطع نظر ادب برائے زندگی کا نظریہ بہت خوب ہے مگر سوال یہ ہے کہ خود زندگی کیا ہے؟ اس کے مطالبات کیا ہیں؟ کوئی زندگی کو شادمانی اور مسرت سے تعبیر کرتا ہے اور کوئی زندگی دسرمستی سے۔ چناں چہ جو لوگ جو زندگی کو سرمستی سے تعبیر کرتے ہیں ان میں اصغر کا نام خاص طور سے آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہیئے مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

وہ شاعری کا حاصل رنگینیٔ جوشِ تخیل کو خیال کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ معترف ہیں کہ ان کا دل درد آشنا نہیں اور وہ دردکی ان لذتوں سے واقف نہیں جو سوز و گداز والوں کے حصہ میں آتی ہیں۔ فانی شاعری کے ذریعہ سیاسی لیڈر، مبلغ اور مذہبی پیشوا بننا نہیں چاہتے۔ ان کا نظریہ یہ ہے۔

"شعر کا حاصل خود شعر ہے اور بس۔ شعر کا تعلق کسی ملک، کسی قوم یا کسی خاص شعبۂ زندگی تک محدود نہیں رہ سکتا۔ وہ بنی نوع انسان بلکہ تمام عالم موجودات کے وجود اور اس کی غیر محدود کشاکش حیات سے تعلق رکھتا ہے[1]"

اپنے اسی نظریہ کی دوسری جگہ وضاحت کرتے ہیں۔

"شاعری کو کسی غیر شاعرانہ مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار نہیں بنایا جاسکتا خواہ وہ مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ مقصد کی بلندی یا اہمیت سے اس اصول میں کوئی فرق نہیں آسکتا[2]۔"

---

[1] و [2] شعر و شاعری از فانی۔ (سب رس۔ حیدرآباد۔ جنوری ۱۹۴۱ء)

بہر نوع اصغر کے یہاں خوشی و شادمانی ہو۔ فانی کے یہاں غم پسندی و دردمندی۔ یہ اپنا اپنا ذوق اور اپنی اپنی نظر ہے۔ سرمستی و شادمانی کے سلسلہ میں ریاض کا نام خاص طور سے آتا ہے اگر وہ درست ہے تو پھر اگر دوسرا حزن و ملال۔ رنج و آلام کا نام زندگی رکھتا ہے تو کیوں قابل الزام ہو۔ زندگی صرف وعظ کی محفلوں اور مزدوروں کی سبھاؤں کا ہی نام نہیں ہے۔ انسانی زندگی کی حقیقتوں میں صرف شادمانی ہی تو نہیں ہے۔ کرب و مصائب کا بھی زندگی میں ایک مقام بلکہ خاص مقام ہے ؎

ہے الم کا سورہ بھی جزو کتاب زندگی

پھر اگر بہ نظر غور دیکھیں تو خود ادب بھی زندگی کے فرائض کی انجام دہی میں نمایاں نظر آئے گا آرٹ زندگی کا ایک ناگزیر پہلو ہے زندگی حقیقت میں اس وقت مکمل ہوتی ہے جب اس میں آرٹ کا تصور بھی شامل ہو۔ شاعر سے یہ مطالبہ کرنا کہ اس نے اپنی فطرت کے خلاف وہ چیزیں کیوں نہ اختیار کیں جو دنیا والے پسند کرتے تھے ایک مضحکہ خیز مطالبہ ہوگا۔

زندگی کے تقاضوں میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان میں جمالیاتی حس ہو۔ جمالیاتی حس ہی دراصل وہ مذاق ہے جو انسان کے وجدان شعری کا پتہ دیتا ہے۔ جمالیاتی حس سے مراد عورت یا جنسی بھوک نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دل کش طریقہ سے اجاگر کر دینا ہے۔ ایک مصور کا یہی فرض نہیں ہے کہ وہ دل کش گلشنوں اور خوش نما روشوں کی تصویریں کھینچ کر ہمارے دل کو لبھائے بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ باغ کے ان گوشوں کو بھی عریاں کرے جو باغباں کے تغافل کے شکوہ سنج ہیں۔ اس کا کام صرف پھولوں ہی کی مصوری کرنا نہیں ہے بلکہ کانٹوں کو بھی ان کا مقام دینا ہے۔ یہی فرائض شاعر کے بھی ہیں کہ وہ صرف زندگی کے حسین پہلوؤں ہی کو نمایاں نہیں کرتا بلکہ اس کی مکروہ اور بھیانک گوشوں کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ بقول نیاز فتحپوری :-

"نقاش ہو یا بت تراش۔ شاعر ہو یا ادیب۔ اس کی تمام فن کاریاں
اس کی ذات کے لئے نہیں دوسروں کے لئے ہیں اس لئے اگر اس کی زندگی
اور اس کا فن دنیا کے حقائق کو اہل دنیا کے لئے گوارا نہ بنا سکا تو یہ قصور
حقیقت کا نہ ہوگا بلکہ فن کار کا جو حقیقت کو موزوں لطیف لہجہ اور مناسب زبان میں پیش نہ کر سکا"[1]
جمالیاتی ذوق کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے اور زندگی کے لئے اخلاقی اقدار
کا ہونا بھی لازمی ہے ممکن ہے کہ منٹو اور عصمت کے افسانے۔ ن۔م۔ راشد اور
میراجی کی نظمیں آرٹ کے نمونے ہوں مگر صحیح زندگی کے حامل نہیں کہے جاسکتے
اس لئے کہ وہ زندگی کے اس مطالبے کو پورا نہیں کرتے جو اخلاق سے متعلق ہے۔
یہی وہ موقع ہے جب آرٹ ابلاغ کے فرائض کی ادائگی میں کوتاہی کرتا ہے اور
زندگی کی عدالت میں مجرم ٹھہرتا ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ذکر فانی کا ہو رہا تھا۔ ان کے یہاں زندگی
ہے اور زندگی کو گذارنے کا سلیقہ بھی۔ ان کی زندگی آلام و حرماں کی زندگی ہے
مگر بے کیف نہیں ہے جہاں وہ زندگی کے تلخ حقایق کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے
تیور دیکھیے۔

ایمان زندگی یہ نہ لا آزما کے دیکھ ‌ ‌ ہر زندگی کا نام نہ رکھ دل کی زندگی
احسان مند ہوں الم جاں گداز کا ‌ ‌ ٹوٹا طلسم ہستیٔ فانی کے راز کا

اعتراض کے اسی سلسلہ کی دوسری کڑی یہ ہے کہ ان کا درد نوجوانوں کے بڑھتے
ہوئے عزم اور ولولوں کے لئے زہر قاتل ہو۔ اگر اس کا ماحصل یہ ہے کہ درد و
الم ہی انسانی زندگی کے لئے مضر ہے تو اس پر ہم اپنے شروع کے ابواب میں
کافی روشنی ڈال آئے ہیں اور اگر اس میں خصوصیت کے ساتھ فانی کے درد والم

---

[1] انتقادیات۔ حصہ دوم از نیاز فتح پوری

اور ان کی قنوطیت کی جانب روئے سخن ہے تب بھی یہ دعوا بے دلیل ہے۔
فانی کی زندگی اور شاعری کا شروع سے مطالعہ کر جائیے وہاں رنج پیکر حرمان و
یاس ضرور نظر آتے ہیں مگر ان کی یاسیت نے شعر و ادب یا زندگی کو نقصان نہیں
پہونچایا انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کی حقیقت کو پہچانا
تھا۔ انھوں نے لوگوں کو نشاط و شادمانی کے حسین سراب کے فریب میں مبتلا
نہیں رکھا جہاں آنسوؤں کو بھی قہقہوں میں اُڑا دیا جاتا ہے۔ وہ دنیا کے بازار سے
گذرنے کے گنہ گار ضرور تھے مگر اس کے خریدار کبھی نہیں بنے۔ وہ صرف حقیقت
پسند شاعر تھے۔

شعبدے آنکھوں کے ہم نے کتنے ایسے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی، بند ہوئی افسانہ تھا

سرور صاحب کا خیال ہے:۔
"فانی کے یہاں غم ہے اور غم کا عرفان بھی۔ وہ فلسفی نہیں لیکن استدلال
اور طرز بیان فلسفیانہ ہے۔ وہ واردات انسانی کے کامیاب مصوّر
ہیں اور قدیم رنگ کے برتنے والوں میں فانی کا لب و لہجہ سب سے زیادہ
آفاقی ہے۔"[1]

اہل سخن سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ فانی کے یہاں نہ تو وہ مرثیت ہے جو لکھنؤ کی غزلی
کا طغرائے امتیاز ہے اور نہ وہ ہمت شکن تعلیم ہے جو ہارڈی اور شوپنہاور کے یہاں
ملتی ہے۔ بقول فراق:۔
"ایسے اشعار کو جنازے بازی یا مرگھٹ کا رونا کہنا تنقید نہیں ہے۔
جھلاہٹ ہے ایسی جھلاہٹ جس پر خود فانی بھی مسکرا دیتے ہیں۔۔۔

---

[1] فانی بدایونی۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ تنقیدی اشارے۔

شاعر عذاب زندگی و گناہ کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ وہ دنیا کی نجات کے لئے صلیب یا پھانسی پر چڑھتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنے آنسوؤں سے دھو کر زندگی کے گرد آلود فضا کو صاف کر دیتا ہے[۱]۔"

فانی کا درد حکیمانہ ہے اور اس میں عرفانیات کا جزو شامل ہے۔ اس نے غم کو مسرت۔ بربادی کو آبادی اور موت کو زیست بنا دیا۔ وہ جب غم کو مسرت خیال کرتے ہیں تو پھر غم غم ہی کب رہا۔

غم فانی و عیش برہم کیا | جاوداں ہو تو عیش ہے غم کیا
غم کو جو خوشی بنا کے چھوڑے | فانی وہ نصیب چاہتا ہوں

فلسفہ کی قدروں اور ایمان کے شعور نے فانی کے غم کا یکسر ڈھانچا ہی بدل دیا۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں غم کو "سوز خوانی" سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا۔ ذرا اس قنوطی شاعر، کے چند اشعار سنئے۔

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاج دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی | آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا
بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار | سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو

اس قسم کے بکثرت اشعار فانی کے کلام میں مل جائیں گے۔ اس کے بعد یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کہ ان کا وجود انسانی زندگی کے لئے زہر کے مترادف تھا۔ دراصل وہ افراد جو زندگی کی پستیوں اور اس کی فرومایہ لذتوں میں مگن ہیں، فانی کے غم کی رفعتوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ فانی نے غم کی حقیقت کو سمجھا۔ اس کی تلخی کو خوش گوار بنایا اور نوجوانوں کو غم (جس کے وجود کا انکار حقیقت کا انکار ہے) کے

---

[۱] فانی بدایونی۔ فراق گورکھپوری۔ علی گڈھ میگزین فانی نمبر

سہارے کا حوصلہ دیا۔

فانی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ غم کی پرورش اور اس کی نمائش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ معترض عظیم بیگ کی مثال دیتے ہیں کہ مصیبت ان پر آئی مگر ان کی ہنسی میں تلخی نہیں پیدا ہوئی[1]

مگر معترض اعتراض کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ ہر شاعری اور ہر آرٹ نمائش کا نام ہے۔ اگر انسانی دل و دماغ میں نمائش کا جذبہ نہ ہوتا تو آرٹ کا وجود ہی نہ ہوتا۔ ساز سے نکلی ہوئی آواز سب کچھ بن جاتی مگر نغمہ نہ بنتی۔ دل کا درد فضا کے لامتناہی فاصلوں میں گم ہو جاتا مگر اس میں تڑپ نہ پیدا ہوتی ایک مصور جب کوئی اپنا شاہ کار بناتا ہے تو کبھی اس کے پردوں کو پیچھے چھپا کر نہیں رکھتا وہ اس کا متمنی ہوتا ہے کہ لوگ اس شاہ کار کو دیکھیں اور اُسکے کمال کی داد دیں۔ تصویر بناتے وقت اس کا مقصد صرف ایک ہوتا ہے کہ اس حسین تصور کو جو اس کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا ہے تصویر کی شکل میں آتار دے جب وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو خواہش مند ہوتا ہے کہ تصویر سے مصور کی وابستگی کا نفسیاتی لمحہ جو اس کو حاصل ہے دوسروں تک منتقل کر دے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو کسی سے اپنے فن کی داد ملے۔ اگرچہ اکثر وفور شوق میں وہ خود اپنے کو داد دے لیتا ہے۔ ع

میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

تاہم دوسروں کو اپنے جذبات میں شریک کرنے کی آرزو ایک نیچرل تقاضا اور انسانی فطرت کا ایک نفسیاتی پہلو ہے۔ یہی حال ایک شاعر کا ہے۔ وہ خونِ جگر سے سینچ کر زمین شعر کی آبیاری کرتا ہے وہ اپنے خیالات کو شعر کا جامہ پہناتا ہے۔

---

[1] دوسرا رخ از سید حامد۔ علی گڈھ میگزین۔ فانی نمبر

اس کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے زخم جگر کی اس کو داد ملے۔ فانی بھی ایک انسان تھا وہ ایک ایسی دنیا کا بسنے والا تھا جہاں انسانی فطرت کے تقاضوں سے مفر نہیں ہے۔ اس کے یہاں درد و الم اس لئے نہیں ہے کہ لوگ اس سے ہمدردی کریں۔ وہ کسی سے ہمدردی کا طلب گار نہیں ہے اور ان کی عزت نفس اس ننگ کو گوارا نہیں کرتی ؎

آ کے تماشا گاہ جہاں میں داد تماشا کیا چاہوں

پھر بھی وہ نفس نمایش کے مخالف نہیں۔ نمایش صرف وہ بری ہے جس میں بناوٹ ہو۔ جس میں حقیقت کی پردہ پوشی کی جائے اور جس میں جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہو۔ مگر وہ نمایش جس میں حقیقت کی جلوہ نمائی ہو۔ صداقت کی کار فرمائی ہو۔ جلوہ سراب کو سراب ہی بتایا جائے، چشمۂ آب کا لیبل نہ لگایا جائے اس کو بے کار یا مضر کہنا دانائی نہیں، ان کے یہ اشعار دیکھئے جو صداقت اور حقیقت کی واضح مثال ہیں۔

مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا — بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا
دبی زباں سے مرا حال چارہ ساز نہ کہہ — بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا
تلاش خضر میں ہوں روشناس خضر نہیں — مجھے یہ دل سے گلا ہے کہ رہنما نہ ملا

وہ فریاد نہیں کرتے بلکہ ایک حقیقت پسند کی طرح زندگی کے چہرے سے پردہ ہٹاتے اور اس کا اصلی رخ دکھاتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر نمایش کا اظہار مذموم ہے تو طرب نشاط۔ رندی اور سرمستی کی نمایش پر اعتراض کیوں نہیں وارد ہوتا۔ پھر لطف یہ کہ غم کے مقابلے میں خوشی و نشاط کی نمایش زیادہ سطحی اور عارضی ہوتی ہے۔ خوشی کی نمایش انسان کو ٹھیک بنا دیتی ہے۔ غم سے آنکھیں چار کر کے اس کو دعوت دینا عام انسانوں کی سطح سے زیادہ بلند انسانوں کا کام ہے۔ جو صرف ابتدا ہی سے

نہیں بلکہ لذتِ ایذا سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے قہقہوں کا کفارہ اپنے آنسوؤں سے ادا کرتا ہے اس کے یہاں، کلبۂ احزاں، لذتِ غم، تیرگیِ شامِ غم اور منزلِ فنا کا نشانِ شکستہ، نمائشی نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ٹھوس حقائق ہیں جن کو شعریت نے اُجاگر کر دیا ہے۔ جن حضرات نے فانی کی زندگی اور ان کی شاعری کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہیں کہ فانی نمائش سے کوسوں دور تھے

معترض نے عظیم بیگ کے مصائب اور آلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ غم میں ہنسنا جانتے ہیں۔ صرف عظیم بیگ نہیں بلکہ سینکڑوں ایسے لوگوں کی مثالیں مل جائیں گی جنھوں نے غم کو اپنے قہقہوں میں گم کر دیا۔ یہ راہِ ل زندگی سے فرار ہے اور قہقہوں میں اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش ہے یہی سبب ہے کہ عظیم بیگ کی نثر میں چند لمحات کے قہقہے ہیں مگر گرمیٔ جذبات کا پتہ نہیں۔ ان کے یہاں صداقت کی کمی ہے۔ ان کے ہونٹوں پر جو ہنسی ہے اس کی آواز دل کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو اس کمی کی وجہ سے ان کے کارنامے حسین مگر بے روح بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور ان کا معیار سطحی درجہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ان کے یہاں غم کی رفعت۔ اس کا نفسیاتی پہلو۔ اور حکیمانہ عرفان تلاش سے بھی نہیں ملے گا۔ فانی بھی چاہتے تو غم کا تدارک قہقہوں سے کر سکتے تھے۔ ان کو بھی اپنے مصائب میں مسکراہٹوں کا سہارا مل سکتا تھا مگر انھوں نے غم کو دور کرنے کے لئے مسکرانا بھی گناہ خیال کیا۔ جو لوگ زندگی کو مسرت و شادمانی کے پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو برنارڈ شا کی یہ تنبیہہ یاد رکھنا چاہیے کہ "محض احمق آدمی خوش رہنا چاہتا ہے" اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زندگی غم و خوشی سے بالاتر شے ہے تب بھی ہم کو اس منزل تک پہونچنے کے واسطے غم کا سہارا لینا پڑے گا۔

اس سلسلہ میں فانی پر تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کا تصوف حقیقی نہیں ہے ورنہ یاس و تصوف دو متضاد چیزیں ہیں۔[۱]

معلوم یہ ہوتا ہے کہ معترض کے ذہن میں تصوف کا ایک رسمی نظریہ ہے اور انھوں نے اس پیمانے پر اس کو ناپنے کی کوشش کی ہے۔ فانی کے تصوف کے سلسلہ میں ہم گذشتہ ابواب میں کہہ آئے ہیں کہ ان کا تصوف عملی نہیں بلکہ نظری ہے۔ اس نظری تصوف نے اگر کائنات کو کچھ نہیں بخشا تو شعر و ادب کو ضروری ایسی روح عطا کی جس سے اس کا بلند معیار قائم ہو گیا۔ جب ہم فانی کو صوفی کہتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کے یہاں عملی تصوف ہے بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مزاج اور لہجہ دونوں تصوف سے ہم آہنگ ہیں۔ مختلف مذاہب میں تصوف کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ عیسائی مذہب نے رہبانیت کی تعلیم دی۔ ہندو مذہب نے یوگ اور بدھ مت نے نروان کا تصور پیش کیا جن مذاہب نے ترک دنیا کی تعلیم نہیں دی انھوں نے بھی دنیا کی بے حقیقتی کا درس ضرور دیا۔ مذہب اسلام کو دوسرے مذاہب کے مقابلے میں امتیازی حیثیت یہ ہے کہ اس نے دنیا میں رہ کر دنیا کی آلودگیوں سے کنارا کرنے کی تعلیم دی ہے دنیا سے فرار ہر شخص اختیار کر سکتا ہے مگر اس کے مصائب کا پامردی سے مقابلہ کرنا مومن کی شان ہے ایک مرد مومن اور منکر میں یہی فرق ہے کہ مومن غم کائنات کو تصوف کی مدد سے گوارا بنا دیتا ہے اور منکر اس سے فرار اختیار کرتا ہے۔ انھیں خیالات کی روشنی میں فانی کے تصوف کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر دنیا سے گذر جانے کا مشورہ دیتے ہیں

---

[۱] دوسرا رخ۔ از سید حامد علی گڈھ میگزین فانی نمبر

اس جگہ ایک اور حقیقت کا اظہار ضروری ہے۔ تصوف ایک خاص نظام فکر ہے جس میں سالک پر مختلف اوقات میں مختلف قلبی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ کبھی قبض کے اثرات غالب ہوتے ہیں کبھی بسط کے۔ کبھی وہ تجلیات کے انقطاع سے افسردہ اور کبھی ان کے تواتر سے شگفتہ ہوتا ہے۔ ہم یہاں مثالاً چند اشعار رومی کے پیش کرتے ہیں جن سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوگی۔

دیں دل بے خود شدہ رفتہ بہ صحرا بہار | آہ کہ بار دگر آتشے در من افتاد
از جگر ہر طرف چشمۂ خوں بر کشاد | آہ کہ دریائے عشق بار دگر موج زد
دود گرفت آسماں آتش من یافت باد | آہ کہ زد آتشے دامن جاں در گرفت

کیا ان اشعار کی بنا پر کوئی ذی ہوش شاعر کے الم کی شدت اور اس کی صوفیانہ نسبت پر حرف گیری کر سکتا ہے۔ فانی کے یہاں لفظ 'یاس' سے ممکن ہو لوگوں کو غلط فہمی ہو کہ وہ خدا کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور ممکن ہے کہ لوگ 'خدا نداشت' (الاقطعہ[1]) جو فانی نے اپنے مرنے کی پیشین گوئی کے طور پر لکھا تھا) پیش کریں، مگر بقول فانی 'خدا نداشت' سے گھبرانے والوں نے 'طغیانِ ناز' کو نہیں دیکھا۔ فانی کے یہاں یاس خدا کی طرف سے مایوسی کے معنی میں کبھی نہیں آیا نہ وہ کبھی شوپنہاور کی طرح کسی اندھی مشیت کے قائل ہوئے۔ دنیا اور اہل دنیا کی طرف سے مایوسی کا اظہار، ان کی زندگی کا تجربہ تھا۔

دل کے سوا یہاں کوئی محرم دردِ دل نہیں | بے خبروں سے کیوں کہیں اہلِ خبر سے کیا کہیں

تصوف دراصل ایک بنیادی نظریہ ہے جو انسان کے عقاید و اعمال پر دیرپا اثر رکھتا ہے۔ یہ بنیادی عقیدہ اسی وقت انسان کے دل میں جاگزیں ہو سکتا ہے

---

[1] اُدوارِ جہاں گذشت کہ آخر خدا نہ بود | واں آں جہاں بہ زیست کہ گوئی خدا نداشت
طغیانِ نازبیں کہ بہ لوحِ مزارِ او | ثبت است سالِ رحلتِ فانی 'خدا نداشت'

جب اس کا دل سوز و گداز سے نرم ہو چکا ہو اور یہی نرمی و گداز معرفت الٰہی کا پہلا زینہ ہے جو غم کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غم اور تصوف کے ڈانڈے آکر مل جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ معترض نے فانی کے ان اشعار پر نظر نہیں ڈالی جن میں وہ کامل یقین کے ساتھ خدا کی رحمت سے رجوع کرتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں چند ایک نہیں بلکہ ہر ہر قدم پر مل سکتی ہیں۔

یہ محشر ہے یہاں جو چاک ہے رحمت بداماں ہے
وہ دنیا تھی جو ہنستی ہی رہی ہر چاک داماں پر

ذکر خورشید قیامت سن کے واعظ کیا کہوں
خیر اس تر دامنی کو روز محشر دیکھنا

ترے کرم سے یہ سماں ہے عالم گناہ کا
یا بیاباں امید کی تجلیاں لئے ہوئے

تیری نگاہ معترف عجز خاک تھی
تیری نظر نے خاک کو انساں بنا دیا

قرباں تری زبان حکیمانہ پہ ہر بات
اب بات بہ انداز کریمانہ بنا دے

فانی کے دل سے آیۂ لاتقنطو کے بعد
زاہد وہ دل فریبیٔ حسن عمل گئی

فضل تیرا شفیع طاعت و زہد
عدل عاصی نواز عصیاں پوش

جو شعر یاد آئے ان کو یہاں سپرد قلم کر دیا گیا۔ یہ اور اسی قسم کے کافی اشعار فانی کے کلام میں مل جائیں گے جن سے ایک مرد مومن کا عزم۔ ایک مسلمان کی شان اعتماد آشکار ہوتی ہے پھر کون کہہ سکتا ہے کہ فانی کا تصوف اس کے قلبی واردات کا نتیجہ نہیں ہے کون کہہ سکتا ہے کہ فانی جب آلام روزگار سے پریشان ہوتا ہے تو وہ یاس و ناامیدی میں لاتقنطو کا دامن بھی چھوڑ دیتا ہے۔

فانی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں بے کیف یکسانگی ہے ان کے خیالات میں تنوع نہیں ہے[1] اسی سلسلہ میں دوسرے معترض کا خیال

[1] دوسرا رخ۔ از سید حامد۔ علی گڑھ میگزین (فانی نمبر)

ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ تخیل کو پرواز عطا کرے اور یہ چیز چونکہ فانی کے یہاں مفقود ہے اس لئے ان کی شاعری نے ہم کو کچھ نہیں بخشا۔[1]

جہاں تک اسالیب بیان کے تنوع کا سوال ہے اس کو معترض نے خود اپنے اسی مضمون میں تسلیم کیا ہے کہ ان کی طرز ادا میں پرکاری اور اسالیب بیان میں تنوع ہے۔ ان کے یہاں گہرائی بھی ملتی ہے اور گیرائی بھی"۔ مگر اس کے ساتھ اس امر کا انکار کرتے ہیں کہ ان کے یہاں خیالات میں بھی تنوع ہے۔ لفظ تنوع اپنے اندر مختلف پہلو رکھتا ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاعر زندگی کے گوناگوں مسائل کی ترجمانی کرے۔ جو ہم کو غالب اور اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ وہ تمام کائنات پر چھا کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کی وسعت کا یہ عالم ہے۔ ع

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

مگر اسی کے ساتھ صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صرف ایک حقیقت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا جائے۔ جیسا کہ درد، مومن، داغ اور حسرت کے یہاں ہے۔ فانی کائنات پر اس طرح حاوی نہیں جیسے غالب۔ بلکہ اس کے ایک پہلو پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ اس کا ہر گوشہ بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اس وصف میں وہ مومن سے زیادہ مشابہ ہیں۔ مومن کی شاعری صرف حسن و عشق کی داستانوں تک محدود تھی مگر ان حدود میں ہی مگر مومن نے اپنی طبیعت کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ فانی بھی زندگی کے صرف ایک گوشۂ غم پر اپنی نظر مرکوز رکھتے ہیں۔ مگر غم کی ماہیت پر وہ اتنے حاوی نظر آتے ہیں کہ غالب کے مقابلے میں ان کی حیثیت شریک غالب کی ہے۔ وہ غم کو ہر زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نہ صرف اس کی ماہیت پر نظر ڈالتے بلکہ فلسفیانہ نظر سے ان کا تجزیہ بھی کرتے ہیں غم کو جتنی ژرف نگاہی سے فانی نے پرکھا ہے اردو ادب کے کسی شاعر نے نہیں

---

[1] ۔ فانی کے نظریہ حیات کا اثر۔ از خلیل الرب (فانی) مرتبہ عبدالشکور

پرکھا۔ یہ چیز خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ فانی نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ نہ تو غالب و مومن کی دلی تھی اور نہ انیس و دبیر کا لکھنؤ۔ شاعری کی آوارہ روح اپنے لئے ٹھکانا تلاش کر رہی تھی۔ فانی کی نادرہ کار طبیعت نے اس کو نشانِ منزل دیا۔ گلستانِ ادب کو شادابی اور طراوت کی ضرورت تھی۔ فانی نے اپنے خون سے اس کو رنگ جاوداں عطا کیا۔ وہ غم کو درد بھی خیال کرتے ہیں اور دوا بھی۔ ان کو زندگی میں لطف اس وقت آتا ہے جب ان کی آرزوئیں ناکام رہیں۔ غرض ہر طرف فانی کے کلام پر غم ہی غم چھایا ہوا ہے مگر کمال یہی ہے کہ وہ غم کو بے کیف نہیں بننے دیتے۔ اور نہ موت کی ہیبت ناکی سے پریشان ہوتے ہیں نہ لکھنوی شعرا کی طرح بلک بلک کے روتے ہوئے نظر آتے ہیں[1]۔ آخر وہ روئیں بھی تو کیوں۔ جب کہ ان کی 'موت'، 'زندگی' سے زیادہ دل کش ہے، ان کی 'خزاں'، 'گلزارِ بہار' سے زیادہ دل فریب ہو' وہ ان ارمانوں کو انعام خداوندی سمجھتے ہیں جو ان کی سعی کا حاصل نہیں ہونے پاتے۔ وہ 'دولتِ دو جہاں' پر 'دلِ مبتلا' کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کا غم بے کیف بے رنگ نہیں۔ اس میں کوئی تلخی نہیں

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں — مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا
دل تو سب کو تری سرکار سے مل جاتے ہیں — ورنہ جب تک نہ ملے دل نہیں ہونے پاتے
میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

---

[1] بکائی جا رہی ہیں ہڈیاں کچھ قید خانے سے — اسیرانِ محبت کو وہ آج آزاد کرتے ہیں
وداعِ دل ہجومِ آرزو میں کیا کہوں تجھ سے — بھرے گھر سے جنازہ جیسے اے ہمدم نکلتا ہے
(عزیز لکھنوی)

سوار ہو گیا مرنا یعنی تمام ہجراں کا — کہ وہ بالیں پہ آئے اور آئے بھی تو منہ ڈھانپا
(محشر لکھنوی)

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ معترضین نے فانی کو اس الزام سے بچا دیا جو عام طور پر غزل گو شعرا پر وارد ہوتا ہے کہ ان کی غزل مختلف مضامین کی وجہ سے معجون مرکب بن جاتی ہے۔ ان لوگوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ ایک شعر میں نشاط و شادمانی کے ترانے گاتے ہیں اور دوسرے شعر میں آہ و فغاں۔ فریاد و شیون کے ہنگامے برپا کرتے ہیں۔ مگر فانی کے یہاں صرف ایک موضوع۔ ایک عنوان اور ایک سرخی "غم" ہے اور یہ یک رنگی ہی فانی کی معراج کمال ہے۔ اس محدود دائرہ کو وسعت بخشنا ہر شاعر کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے تخییل کی بلند پروازی اور نگاہ کی تدرت کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے شاعر اور فلسفی دونوں کی بہ یک وقت نگاہ چاہیے۔ بہ تقاضائے بشریت ان کے یہاں یاس کے جذبات بھی ملتے ہیں مگر عام حالات میں ان کا فلسفہ بہت بلند ہے۔ وہ ہمارے خیالات کو اتنا بلند کر دیتے ہیں جو انسانی ترقی کا منتہائے کمال ہے۔ رفعت و ندرتِ خیال کی بہترین مثالیں دیکھنا ہوں تو یہ اشعار پڑھیئے:۔

خود برق ہو اور طورِ تجلا سے گذر جا — خود شمع بن اور وادئ سینا سے گذر جا
بے واسطہ خود نگری اپنی طرف دیکھ — آئینہ اُٹھا۔ حسنِ خود آرا سے گذر جا
اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک — اس مرحلۂ سعیٔ تماشا سے گذر جا
اے عزم خبر ہوش کے پردوں کو الٹ دے — اے ذوقِ نظر محملِ لیلیٰ سے گذر جا

دوسری غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا — رخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے
تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر — نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے
خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانی — آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

بعض اوقات فانی تخیل کے بعض اجزا اس طرح چھوڑ جاتے ہیں کہ جس بلندی پر سے وہ صدا دے رہے ہیں وہاں تک جانے کا راستہ کاوش سے تلاش کرنا ہوتا ہے اور

ان کی رفعتِ پرواز کو چھونے کے لئے دوسروں کو بھی اتنی ہی پرواز کرنی پڑتی ہے۔
اگر کوئی اس بلندی تک پہونچنے میں ناکام رہے تو فانی کو سمجھنا معلوم۔ اس اعتراض کا
دوسرا جزو کہ فانی کی شاعری نے ہمیں کچھ نہیں بخشا۔ اسی طرح مضحکہ خیز معلوم ہوتا،
جیسا کہ اس کا پہلا جزو۔
تنقید کا ایک غلط اصول یہ ہے کہ ہمارے ناقد، شاعر یا ادیب پر اپنی مرضی ٹھونستے
ہیں۔ یعنی ایک شخص سے ایسی چیز کا مطالبہ کرتے ہیں جس سے اس کو سروکار نہیں
ہے۔ مثلاً شاعر سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے کسی سیاسی یا مذہبی
عقیدے کی تبلیغ کرے یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک مصور سے موسیقی کی فرمائش کرنا
اگر ایک مصور فنِ موسیقی میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہے تو یقیناً ایک باکمال انسان
ہے لیکن اگر وہ صرف ایک اچھا مصور ہے تب بھی اس کے کمالات اپنی جگہ
لائق ستائش ہیں۔ حقیقت میں دیکھنا یہ ہے کہ وہ جس راستہ پر جارہا ہے کیا
اس کے مطالبات پورے کرتا ہے؟ اگر وہ اس کے مطالبات سے عہدہ برا
ہوتا ہے تو یقیناً ایک بلند مرتبہ فن کار ہے۔ ورنہ اس کا فن اس کے حق
میں رحمت نہیں لعنت ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی شخص میر
سے نیچرل نظموں۔ غالب سے ترقی پسند شاعری۔ انیس سے جرأت کی معاملہ
بندی کی توقع کرے اس اصول کی روشنی میں اس اعتراض پر نظر ڈالئے
کہ فانی نے ہم کو کچھ نہیں دیا۔ اگر معترض ان کے کلام میں سیاسی تحریکات۔
سماجی مسائل کی توقع کر رہے تھے تو یقیناً ان کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ فانی نہ
سیاست داں تھے اور نہ واعظ۔ وہ صرف شاعر تھے اور آرٹسٹ۔ وہ دل کے
ٹوٹے ہوئے ارمانوں کے شعر کے سانچے میں ڈھالا کرتے تھے۔ انھوں نے
ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنے فرائض کو بہ حسن و خوبی انجام دیا۔ اگر یہ

کہا جائے کہ کوئی آرٹسٹ زندگی کو کچھ بھی بخشنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو فانی نے بھی زندگی کو کچھ نہیں بخشا۔ لیکن اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ آرٹ بھی زندگی کا ناگزیر جزو ہے تو فانی نے زندگی کو آرٹ بخشا۔ ارسطو کا خیال ہو کہ المیہ کا درجہ طربیہ سے بلند ہے۔ شیلی کا قول ہے کہ ہمارے سب سے شیریں نغمے وہ ہیں جن میں غم کی لے ملتی ہے۔ فانی نے زندگی کو المیہ کا احساس جمالیاتی حسن کے ساتھ عطا کیا۔ شاعر کو چند خود ساختہ قیود کا پابند کر دینا زندگی اور شاعر دونوں کی توہین ہے کسی کو کیا حق ہے کہ شاعر پر قید لگائے کہ نغمہ ہو مگر اس سے حزن و ملال کے راگ نہ نکلیں صرف سرور و انبساط کے سُر پیدا ہوں۔ فانی نے ہمارے سخت بد لوں کو جذبات اور جذبات کو گرمی بخشی۔ انھوں نے انسانی جذبات کا احترام کیا اُن سے کھل کھیلنے کی اجازت کبھی نہیں دی۔ انھوں نے شاعری کو روحانیت کی رفعت عطا کی۔ جب وہ منزل آتی ہے جہاں درد سراپا درد ابن جاتا ہے جب شاعر کا اپنا غم کائنات کے غم میں مدغم ہو جاتا ہے۔ جب موت زندگی کے بھیس میں رقصاں نظر آتی ہے۔ اس وقت وہ زندگی کو اس سطح سے نہیں دیکھتا جہاں عوام کی رسائی ہو۔ اس کا اپنا زاویہ نظر ہوتا ہے۔ اس کا اپنا فلسفہ زندگی ہوتا ہے، اس کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔

فانی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں ٹھوس خارجی احساس کا نقدان ہے۔ اس کے برخلاف غالب بین الاقوامی ادب میں MASTER OF REALITY کی حیثیت سے جگہ پاتا ہے۔ معترض کا خیال ہے کہ غالب کے اشعار میں سچے اور زندہ تجربے نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف فانی 'بزم تماشا کے وجود کا ذوق نظر' کی حد تک قائل تھے۔ آگے چل کر معترض نے اعتراف

کیا ہے کہ فانی کے یہاں متفکرانہ گہرائی بھی ہے اور روایت ادب کا خوش سلیقہ اہتمام بھی اور تڑپا دینے والے نشتر بھی۔ لیکن اس کو شکایت ہے کہ نہیں ہے تو ذوق و شوق کی وہ تلازم آشامی جو دنیا کی ہر چیز کو حسین اور دل کش بنا دے۔[1]

غالب اور فانی کا موازنہ کرتے وقت اگر یہ کہا جائے کہ غالب کے کلام میں زندگی کے تجربوں کا تنوع ہے تو درست ہے لیکن یہ کہنا کہ فانی کے یہاں ٹھوس خارجی احساس کا فقدان ہے۔ اور غالب کے یہاں نہیں ہے تو یہ فیصلہ بڑی حد تک یک طرفہ ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ غزل کا شمار خارجی شاعری میں نہیں ہو بلکہ داخلی میں ہے۔ شاعر اپنے جذبات و احساسات کی دنیا میں رہتا اور اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے بھی اس سے لطف اندوز ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غزل کی داخلیت بھی خارجی محرکات سے یکسر بے نیاز نہیں ہوتی۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ ان خارجی محرکات کے باوجود وہ تجربات شاعر کی ذاتی زندگی کے داعیات کا ٹھپّہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے ہم غزل کو داخلی کہتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے وہ یہ کہ شاعر کے تجربات اگر واقعی زندگی اور خصوصاً شاعر کی زندگی سے ہم آہنگ ہیں تو ان میں ایک آفاقی صداقت بھی پائی جائے گی۔ غزل کی ہیئت کے ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب و فانی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں اپنی زندگی کے اندرونی تجربے بیان کرتے ہیں اور چونکہ وہ تجربے ایک متوسط حساس اور ذہین انسان کے تجربے ہیں اس لئے ان میں یک گونہ ہمہ گیر انداز پایا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ ہمارے خیال میں غالب و فانی میں جو کچھ فرق ہے وہ "اطلاق" (DENOTATION) اور "وصف"

---

[1] مالہ ماعلیہ از صبیح احمد کمالی نگار اپریل سنہ ۱۹۴۹ء

(CONNOTATION) یا باالفاظ دیگر کمیت (QUANTITY) اور
کیفیت (QUALITY) کا ہے ۔ اس کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ غالب کی فکر
میں وسعت زیادہ ہے اور فانی کے یہاں گہرائی زیادہ ہے ۔ فانی نے غم
وعشق کے مضامین ایسے پیرایہ میں ادا کیے ہیں جو عام شاعر یا مفکر کے بس
کے نہیں ہیں ۔ انھوں نے نفسیات کی تہہ میں ڈوب کر حقائق کے نازک اور
نادر موتی نکالے ہیں ان مضامین پر غالب نے بھی کہا ہے اور خوب کہا ہے
لیکن شاید اس نزاکت سے نہیں ۔ ان کی تصویروں میں مُو قلم کے وہ باریک
خطوط نہیں جو فانی کے یہاں ملتے ہیں ۔ لیکن اس کے برخلاف ان کے
یہاں بہت سے ایسے مضامین ہیں جو فانی کے یہاں مفقود ہیں ۔ غالب نے
زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا اور ہر پہلو کے بارے میں اپنے تجربے کمال فن کے ساتھ
پیش کر دیے ۔ فانی کے یہاں وسعت خیال کی وہ مثالیں تو نہیں ملیں گی جو
غالب کے یہاں ہیں البتہ غم کے تجربات میں ڈوب کر جس زندگی کی کھوج
فانی لگاتے ہیں وہاں غالب کی رسائی نہیں ۔

یہ کہنا کہ فانی کی تخیل 'بزم تماشا' ہی تک محدود ہے غلط ہے ۔ اشعار
ذیل کو پڑھیے اور ذرا فانی کی اس محدود نظر کو دیکھیے کہ اس کی رسائی
کہاں تک ہے ۔

مراد جو دہے ۔ میری نگاہ خود نشناس — وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا
تری تلاش کا افسانہ گر بیاں ہوتا — رہِ مجازہ ہر ذرہ اک زباں ہوتا
حجاب اگر من و تو کا نہ درمیاں ہوتا — پیام حسن و محبت کی داستاں ہوتا

تھا حریم ناز ان کا دل کی آخری منزل
ہم نے ان کو ڈھونڈھا تھا کھو گیا نشاں اپنا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

معترض کو ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ فانی کے یہاں تڑپا دینے والے نشتر تو ہیں لیکن ذوق و شوق کی کمی ہے جو ہر شے کو حسین بنا دے۔ اس امر میں معترض کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ فانی ہی کی ذات دنیائے ادب میں ایسی نظر آتی ہے جس نے بھیانک سی بھیانک اور مہیب سے مہیب شے کو بھی حسین بنا دیا ہے۔ موت۔ گور و کفن۔ زنداں۔ جبر۔ فراق جیسی لرزہ خیز حقیقتوں سے بڑھ کر اور کیا خوفناک چیزیں ہوں گی۔ مگر یہی موت جب فانی کے یہاں آتی ہے تو حسین اور دل کش بن جاتی ہیں۔

ادا سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے میری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

ہاں شب ہجر آج صبح نہ ہو ہاں چلی جائے یاد زلف دراز

زندگی یاد دوست ہے یعنی زندگی ہے تو غم میں گذرے گی

خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسم گل آ گیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں

نگار میں مالہٗ و ما علیہ کے تحت فانی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ فانی کے برخلاف غالب کی غزل شاعری کی صحیح اور مکمل نمائندگی کرتی ہے۔ فانی کے یہاں خلوص تو ہے لیکن تحریک فن کے ناگزیر ہونے کا احساس مفقود ہے اور اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ اشعار باوجود نفسیاتی سچائی کے صرف سطح کی پیداوار ہیں اور بڑی حد تک تخیل کی اختراع کا نتیجہ ہیں۔[۱]

[۱] مالہٗ و ما علیہ صبیح احمد کمالی نگار اپریل ۱۹۳۶ء

شاید اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی آرٹسٹ کسی اندرونی جذبہ سے متاثر ہو کر اپنے آرٹ کو بروئے کار لاتا ہے تو مبصرین کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا آرٹ ایک خاص احساس کا نتیجہ ہے اور وہ احساس آرٹسٹ کے اندر اس قدر شدید اور پر جوش ہے کہ لامحالہ اس مخصوص آرٹ کی شکل میں ڈھل گیا ہے۔ معترض کے نزدیک اگرچہ فانی کے یہاں خلوص ہو مگر ان کی شاعری میں یہ احساس مفقود ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اعتراض قطعاً غیر صحیح ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک شاعر یا آرٹسٹ کے یہاں خلوص کا ہونا اور تحریک فن کے ناگزیر ہونے کا احساس زیادہ متفادت چیزیں نہیں ہیں۔ بجز ان شعرا کے جو طرح کو سامنے رکھ کر قافیہ پیمائی کر لیا کرتے ہیں اور قافیوں پر مصرعے لگاتے چلے جاتے ہیں۔ کسی بڑے شاعر کا کلام اس احساس سے خالی نہیں ہوتا یہ اور بات ہے کہ بعض جگہ یہ احساس زیادہ شدید ہو اور بعض جگہ کم۔ ورنہ اگر اسی قسم کی بدگمانی کو راہ دی گئی تو غالب یا میر یا کوئی شاعر بھی ہدف اعتراض ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ جب معترض نے یہ تسلیم کر لیا کہ فانی کے کلام میں خلوص موجود ہے یعنی جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں وہی کہتے ہیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تضاد کی گنجائش کیوں کر نکل سکتی ہے کہ وہ تحریک فن کے ناگزیر ہونے کے احساس سے عاری ہیں۔ اس لئے کہ عقل یہ چاہتی ہے اور ادبیات کے اصول بھی اس کے موید ہیں کہ خلوص صرف اسی کے کلام میں ہو سکتا ہے جس میں دل پر گذری ہوئی واردات کا بیان ہو اور ظاہر ہے کہ اس خلوص کے ساتھ سطحیت کا دخل ناممکن ہے۔ لہذا معترض کو ان کے خلوص کے اعتراف کے ساتھ یہ کہنا کہ ان کے اشعار صرف سطح کی پیداوار ہیں اور پختگی مشق، کا نتیجہ ہیں۔ اپنے ہی بات کی تردید کرنا ہے ایک پختہ مشق شاعر کے یہاں فنی استقام کا عنصر درپیش نہیں ہوگا مگر نفسیاتی سچائی صرف واردات قلب کے ترجمان ہی کے یہاں ملے گی جس کو اس نے اپنے

خونِ دل سے سینچ سینچ کر پروان چڑھایا ہے۔

اکثر معترضین فانی کی شاعری میں اس تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ ایک لمحہ میں تو غم سے گریزاں نظر آتے ہیں اور دوسرے وقت میں اس کو سلیقہ سے لگانے کی تمنا کرتے ہیں۔ کبھی ان پر غم کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ رنج والم سے گرانبار ہو جاتے ہیں اور کبھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آتی ہے

اس سوال کے جواب میں فطرت کا یہ اصول یاد رکھنے کے قابل ہو کہ انسانی زندگی میں کیفیات اور جذبات کا بدلنا ایک ناگزیر امر ہے۔ زندگی سے مایوس مریض کی زندگی میں کچھ لمحات ایسے ضرور آتے ہیں جب وہ مسکرا اٹھتا ہے۔ اپنی زندگی سے مایوسی کے باوجود وہ دوسروں کو زندگی کی اہمیت سمجھاتا ہے۔ اس کو برتنے اور سلیقہ سے گذارنے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی حال فانی کا ہے وہ بھی انسان تھے اور انسانی تقاضوں سے بے تعلق نہیں تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک دن نواب نثار یار جنگ حیدرآباد میں فانی سے ملنے گئے۔ مزاج پرسی کے بعد نواب صاحب نے فانی سے کہا "فانی تم مر نہیں سکتے۔ تمہاری انرجی ضائع نہیں ہوئی" وہی فانی جو مرگِ ناگہاں کے انتظار میں زندگی گذارا کرتے تھے ان الفاظ کو سن کر ان کا چہرہ مسکرا اٹھا وہ چند لمحات کے لئے ایک نئی زندگی کے تصور میں محو ہو گئے۔ یہی سبب ہے جب ان کو دنیا تیرہ و تار نظر آتی ہے تو بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں۔

گذرے گی نہ اب غم کا مداوا کئے بغیر
نامرادی حد سے گذری حالِ فانی کچھ نہ پوچھ
یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے کہ دوا بھی دی

بنتی نہیں اجل سے تقاضا کئے بغیر
ہر نفس ہو اک جنازہ آہ بے تاثیر کا
فانی نا امید کو موت کا آسرا دیا

سلہ فانی بدایونی از ماہر القادری۔ علی گڑھ میگزین۔ فانی نمبر

دیارِ عمر میں اب قحط ہر ہے فانی — کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

مگر ان کے یہاں غم سے جو گریز کی کیفیت ملتی ہے وہ بہت عارضی ہے۔ ان کے یہاں گریز کے ان لمحات کی طرح خوشی اور مسرت کے لمحات بھی عارضی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ فانی کے چہرے پر یہ مسکراہٹ کبھی آسکتی ہے۔

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے — وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے
اب انھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے — چشم بد دور دلہن بن کے شباب آتا ہے
ابر اٹھا سمت حرم سے زاہد — تو بھی سجادہ الٹ۔ جام اُٹھا
فرش گل پھر بچھا رہی ہے نسیم — آیئے موسم بہار آیا
تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب — اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں جل گئی

اس قسم کے اشعار ان کے کلام میں جگہ جگہ مل جاتے ہیں۔ مگر یہ مسرت و شگفتگی بھی عارضی ہے۔ ان کے یہاں عام طور سے وہ کیفیت ہے جو غم کو گوارا بنا دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے غم میں شدت تو ہے مگر تلخی نہیں۔

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا — دولتِ دو جہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا
وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں — مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا
مزاجِ دہر میں ان کا اشارہ پائے جا — جو ہو سکے تو بہر حال مسکرائے جا
جلوہ محسوس سہی آنکھ کو آزاد تو کر — قیدِ آداب تماشا بھی تو محفل سے اٹھا
آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو — ان کے آگے جو بار بار آیا
ہم قیامت کو قیامت ہی نہ سمجھے صبحِ حشر — حشر تک آنکھوں میں شاید جلوۂ جاناں نہ تھا
وہ کہتے ہیں کیا ہے ٹوٹے ہوئے دل پہ زخم ترا — مگر من جملۂ آدابِ غم خواری ہے غم میرا
ادا سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے — مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

اردو غزل میں فانی کا مقام

اردو غزل میں فانی کا مقام

اُردو غزل میں فاؔنی کا مقام

غزل پر بحث کرتے ہوئے علامہ شبلی نے سچ کہا تھا۔

"عشق و محبت انسان کا خمیر ہے۔ اس لئے جہاں انسان ہے، عشق بھی ہے اور چوں کہ کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں اس لئے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے بھی خالی نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایران اس خصوصیت میں اور تمام ملکوں سے بڑھا ہوا ہے۔ یہاں مدت دراز کے تمدن نے انسانی جذبات کو نہایت لطیف اور زود اشتعال بنا دیا تھا۔ اس لئے زراسی تحریک سے یہ شعلہ بھڑک اٹھتا تھا اور دل و دماغ کو آتش نشاں بنا دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جس قدر عشقیہ شاعری کو ترقی ہوئی اور اصناف سخن کو نہیں ہوئی"[1]

درحقیقت فارسی شاعری نے غزل کی صنف اور حسن و عشق کے موضوع پر جو قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے وہ ادبیات عالیہ کی جان ہے۔ واردات قلبی کے نازک سے نازک جزیے اور روداد عشق کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے کو ایرانی شاعر جس لطف سے کہہ جاتا ہے اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اہل دل سینے اور کلیجہ تھام کر رہ جائیں۔ ایک طرف سعدی کے ترانے ہیں جو اپنے فطری جذبات اور شیریں انداز سے دل موہ لیتے ہیں۔ دوسری طرف حافظ کے نغمے ہیں جن کی عارفانہ

---

[1] شعر العجم۔ جلد پنجم

لَے اور رندانہ سرمستی، مجاز کے ڈانڈے حقیقت سے ملا دیتی ہے۔ کہیں خسرو کا سوز و گداز ہے کہیں حسن بدایونی کا اثر آفریں انداز۔ عرفی کا فلسفہ۔ نظیری کا تغزل۔ بیدل کے افکار کی گہرائی و گیرائی۔ غالب کی شوخی و رعنائی۔ جدھر دیکھئے۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

باتیں وہی ہیں جو ہم اور آپ اکثر دیکھتے اور سنتے آئے ہیں۔ لیکن ان کے زبان و قلم کی بدولت یہی باتیں سحر سامری بن جاتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اول تو یہ شعرا حساس طبیعت اور چوٹ کھایا ہوا دل رکھتے تھے) اکثر نے تو دنیا کو دیکھنے کی طرح دیکھا تھا اور نظر کی وسعت اور تجربہ کی دولت حاصل کی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ نظر پر لطالت کا پرتو اور تجربہ پر عشق کی چھاپ تھی۔

از دل ما غم دنیا غم معشوق شود   بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

دوسرے غزل کی ترقی کا زمانہ اور تصوف کی گرم بازاری کا دور ایران میں تقریباً ایک ہی تھا اور ظاہر ہے کہ تصوف کا خمیر سرمایۂ عشق و محبت ہی ہے۔ رومی نے کیا خوب کہا ہے ؎

جرعۂ خاک آلود چوں مجنوں کند   صاف اگر باشد ندانم چوں کند

نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر رومی، عراقی، سعدی، حافظ، مغربی، جامی نے عشق کے ساز پر کوئی نغمہ چھیڑا ادھر تمام ملک کی فضا گونجنے لگی۔ ہندوستان کی فارسی شاعری اور بعد کو اردو شاعری کی لہریں بھی ایران ہی کے سرچشمے سے نکلی ہیں۔ حتی کہ قدیم اردو شعرا میں بہت کم ایسے افراد ہوں گے جنھوں نے اردو کے ساتھ فارسی کلام بطور یادگار نہ چھوڑا ہو۔ مگر ہمیں یہاں عام شاعری سے نہیں بلکہ غزل اور اردو غزل سے بحث کرنا مقصود ہے۔

غزل بڑی کافر صنف ہے جو مشکل سے کسی کے قابو میں آتی ہے۔ دراصل غزل بہت آسان بھی ہے اور نہایت دشوار بھی۔ اور ہر بزم مشاعرہ میں غزل گو اصحاب کی تعداد سینکڑوں تک پہونچ جاتی ہے تاہم ایسے غزل نگار جن کا کلام سن کر سامعین چونک پڑیں معدودے چند ہی ہوتے ہیں۔ شعرا کے تذکرے دیکھ جائیے۔ غزل گویوں کا ایک جم غفیر ملے گا۔ لیکن ممتاز اساتذہ غزل شاید دس پندرہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ میر۔ سودا۔ درد۔ سوز۔ قائم مصحفی۔ آتش۔ مومن۔ غالب۔ داغ پر قدیم غزل گوئی کا خاتمہ ہو جاتا ہے ان کے بعد حالی۔ اقبال۔ شاد۔ حسرت۔ فانی۔ اصغر۔ جگر کا عہد آتا ہے۔ جنھوں نے پرانے طرز شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ اور غزل کو نیا آب و رنگ دیا۔ جب یہ حال ہے تو سمجھ لیجئے کہ جو شخص اس محدود صنف میں اپنے لئے ایک مستقل اور باوقار مقام حاصل کر سکتا ہے وہ کس قدر بلند پایہ ہوگا فانی بھی ان کاملین فن میں ہیں جن کا مرتبہ غزل میں تمام ناقدین ادب نے تسلیم کیا ہے۔

صنف غزل کی مشکلات سے ہم کو انکار نہیں۔ اصل میں تو یہ تو حسن کے کرشموں عشق کے ولولوں۔ وصل کی شادکامی۔ ہجر کی نامرادی اور اسی قبیل کے مضامین کے بیان کے لئے وضع کی گئی تھی۔ لیکن بعد کو اس کے دامن کی وسعت میں تصوف۔ اخلاق۔ سبھی کچھ سما گئے مگر شرط یہ ہے کہ انداز کی شعریت اور حسن کاری پر زد نہ آئے ورنہ وہ اور جو کچھ بھی ہو، غزل نہ ہوگی۔ پھر اس کی زبان انتہا سے زیادہ نرم اور شیریں، اور پیرایہ اس قدر ہلکا پھلکا ہو کہ سامع پر گراں نہ گذرے۔ اسی کے ساتھ غزل کا ہر شعر بجائے خود خیال کی ایک یونٹ ہو جو ہر اعتبار سے خود مکتفی ہو۔ نظم کے برخلاف جس کا ہر شعر دوسرے شعر کا محتاج ہوتا ہے سب پر مستزاد بحر، قافیہ اور ردیف

کی قیود جو دوسری اصناف کی طرح غزل کے لئے بھی ناگزیر ہو گئی ہیں کہ آمیر مینائی نے جب کہا تھا کہ

آمیر اک مصرع تر جب کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب ہوتا ہے شاعر کا لہو برسوں

تو یقیناً ان کی نظر میں غزل کی یہی پابندیاں رہی ہوں گی۔

شاید یہی اسباب تھے کہ گذشتہ چند برسوں میں غزل کے خلاف مخالفت کا ایک سخت طوفان اُٹھا تھا اور ڈر تھا کہ غزل اس طوفان کی تاب نہ لائے گی اور ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آخر وہ طوفان فرد ہو گیا اور غزل پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ اُبھری۔

غزل پر معترضین نے جو فرد جرم لگائی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) غزل غیر فطری ہے کیوں کہ اس میں منتشر خیالات ہوتے ہیں۔

(۲) اس کا انداز روایتی ہے۔

(۳) وہ جاگیردارانہ عہد حشمت کی یادگار ہے۔

(۴) اس میں غیر ضروری قیود ہیں۔

چونکہ ہماری زبان کے فاضل اہل قلم ان اعتراضات کے مفصل اور مدلل جواب دے چکے ہیں اس لئے ہم یہاں ان سے قطع نظر کرتے ہیں اوپر عرض کیا گیا تھا کہ فانی ان شعرا میں ہیں جن کا شعری مرتبہ تمام ناقدین نے تسلیم کیا ہے۔ قبل اس کے کہ اس پر تفصیلاً اظہار خیال کیا جائے چند باتیں پیش نظر رہنا چاہئیں۔

فانی کے تمام سوانح حیات پر روشنی ڈالنا تو ان کے سوانح نگار کا فرض ہے، تاہم یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انھوں نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو ثروت و جاہت میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ زمانہ زوال ثروت و جاہت فانی کے

دیکھتے دیکھتے بڑائے نام رہ گئی۔ وہ قدرت کی طرف سے ایک حساس طبیعت اور
ایک تاثر پذیر دل لے کر آئے تھے۔ ان حالات سے ان کا متاثر ہونا عین تقاضائے
فطرت تھا۔ اس پر باپ کی سخت گیری۔ مالی مشکلات اور بعض عزیزوں اور دوستوں
کی بے مروتی اور زمانے کی ناقدری نے ان کو متشائم بنا دیا۔ جہاں تک خیال ہے
عشق اور اس کی ناکامیوں نے بھی ان کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ علاوہ ازیں
وہ ایک معزز افغانی النسل خاندان کے فرد تھے۔ اس لئے بعید نہیں کہ وہ
فیاضی۔ عالی ظرفی۔ وضعداری۔ مروت اور غیرت جو ان کے اخلاق کا طرۂ
امتیاز تھی، خاندانی وراثہ کا نتیجہ ہو۔ ان کا مذاق سخن فطری تھا جس پر بدایوں کے
ادبی ماحول اور بریلی کالج اور ام اے او کالج علی گڈھ کی سنجیدہ صحبتوں نے اور
بھی جلا بھی کر دی۔

اگرچہ جو تھوڑا بہت فارسی کلام فانی نے چھوڑا ہے یا اردو میں غزل کے علاوہ جن
اصناف پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے وہ بھی کسی طرح نظرانداز کئے جانے کے
قابل نہیں۔ لیکن اردو غزل ان کی معراج کمال ہے اور اسی نے ان کو اردو
شاعری میں ایک مستقل مقام عطا کیا ہے۔ اس لئے یہاں اسی کے بارے
میں اظہار خیال مقصود ہے۔

فانی کی غزلیہ شاعری عشق۔ غم، تصوف اور اسرار کائنات کے
محوروں کے گرد گھومتی ہے۔ چاہیں تو یہ کہہ لیجئے کہ عشق کی بدولت فانی غم سے
دوچار ہوئے اور غم کی جب جلا ہوئی تو اس نے تصوف کے آستانے تک
پہونچایا اور تصوف نے اسرار کائنات سے پردہ اٹھایا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ موضوعات فانی کے یہاں روایتی اور رسمی نہیں
ہیں۔ انھوں نے ان پر فکر کی ہے۔ برتا ہے اور محسوس کیا ہے اور اس طرح یہ

ان کی ہستی کا جزو بن گئے ہیں۔ یہ خیالات اور جذبات ہمارے اکثر شعراء کے یہاں تقلیدی رنگ میں ملتے ہیں مگر فانی کے یہاں ان پر شاعر کی شخصیت کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ رہی ان کی زبان اور تراکیب خاص۔ اس کے بارے میں ان کو اپنے وطنی ماحول اور اپنے فارسی ذوق سے خاص مدد ملی۔ اب ہم ان موضوعات کو فرداً فرداً لیتے ہیں۔

(الف) عشق :- عشق کی افتاد اور حسن کی روداد غزل کی جان ہے اور فانی تو شاعرانہ ذوق کے ساتھ عاشقانہ مزاج لے کر آئے تھے۔ اس لئے ان کی شاعری ہر چہ گوید دیدہ گوید کی مصداق ہے۔ ان کو قریب سے دیکھنے والوں نے انکے حسن پرستی اور ذوق جمال کے بعض واقعات سنائے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن کا احترام ہی نہیں عشق کا رکھ رکھاؤ بھی مدنظر رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں ایک خاص رچاؤ اور بھاری بھر کم پن تھا جو ان کو بوالہوسی کی پستیوں میں گرنے سے باز رکھتا تھا۔ آئیے دیکھیں کہ ان اشعار سے اس کی تصدیق کس حد تک ہوتی ہے۔ ان کا شعر ہے۔

غم کیا ہے اگر منزلِ جاناں ہے بہت دور — کیا خاک رہ یار ہوا بھی نہیں جاتا

منزل جاناں تک رسائی دشوار سہی مگر اس کی راہ میں خاک ہو جانا تو دشوار نہیں۔

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز — کوئی تو اہل وفا کا مزاج داں ہوتا

اہل وفا کے مٹانے کے لئے معشوق کی ہر ادا قاتل ہو سکتی ہے۔ کچھ جفا ہی پر موقوف نہیں۔

وحشت بقید چاک گریباں روا نہیں — دیوانہ تھا جو معتقد اہلِ ہوش تھا

فانی کا عشق اور جنون دونوں رسم پرستی سے بالا ہیں۔ ان کی وحشت مسلّم، مگر کیا فرض کہ اس کی خاطر گریبان ہی چاک کیا جائے۔ ع

عشق کارے ست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

یہاں انھوں نے حسب عادت الفاظ کو خاص مفہوم کے لئے استعمال کیا ہے یعنی دیوانہ نادان کے معنی میں اور اہلِ ہوش رسم پرستوں (جنوں میں گریباں پھاڑنے والوں) کے معنی میں۔ "در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست"

تھی ہر تڑپ سکون کی دنیا لئے ہوئے — پہلو میں آپ تھے کہ دلِ ناصبور تھا

(شاعر عشق میں اس منزل پر پہونچ گیا ہے جب ہر تڑپ میں اس کو آرام ملتا ہے اس موقع پر محبوب سے پوچھتا ہے کہ شاید میرے پہلو میں دل نہ تھا بلکہ آپ تھے۔ ورنہ آرام ملنا کیا معنی، عشق کی بے تابی اور بے تابی سے چین آجانا اوروں نے بھی لکھا ہے مگر یہ توجیہ صرف فانی کا حصہ ہے۔)

بالیں پہ تم جب آئے تو آئی وہ موت بھی — جس موت کے لئے مجھے جینا ضرور تھا

دوست کا بالیں پر آنا اور عاشق کا جان دے دینا، عاشقی کی دنیا کا عام واقعہ ہے۔ لیکن فانی کے اچھوتے طرز بیان نے اس میں خاص ندرت پیدا کر دی۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس موت کی تمنا میں جی رہا تھا کہ ادھر تم آؤ ادھر میں جان نذر کر دوں 'وہ موت بھی' کا ٹکڑا اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

اٹھ کر چلے تو حشر بھی اٹھنا تھا کیا ضرور — ان کی گلی سے مدفنِ فانی تو دور تھا

محبوب اپنی گلی سے اٹھ کر چلا (اپنی حشر خرامی کا مظاہرہ کرنے یا رقیب سے ملنے کے لئے) اور اس کے اٹھتے ہی قیامت برپا ہو گئی۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر وہ اٹھے تھے تو کم از کم حشر ہی نہ اٹھاتے۔ اور اٹھانا ہی تھا تو مدفن فانی کے قریب اٹھایا ہوتا۔ اس کے بعد فانی پر کیا گذرتی اس کو سامع کے ذوق پر چھوڑ دیا ہے۔

میرے دلِ غیور کا حسنِ طلب تو دیکھ — گویا زباں پہ حرفِ تمنا گراں نہ تھا

حسن طلب یہ ہے کہ کوئی چیز لطیف پہلو سے مانگے۔ عاشق کا دل غیور ہے اس لئے

حرفِ تمنا کا زبان پر لانا کارے دارد۔ تاہم زبان پر آیا گو اس کی خودداری کا خون ہوگیا
اس احسن طلب، شی بھی اگر قدر نہ ہو تو وائے بر عاشقی۔

تم نے دیکھا ہی کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ | آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

شعر میں مومن کا سا انداز ہے۔ یعنی محبوب سے اپنی عرض اس طرح بیان کرنا کہ اس کو
اپنا فائدہ نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ آئے گا تو عاشق کے گھر کا نقشہ بدل
جائے گا۔

اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارۂ جمال | منھ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا

داغ نے کہا تھا۔

عالم تمام چشمِ حقیقت نگر بنا | آئینہ دیکھتا ہے منھ آئینہ ساز کا

لیکن فانی اس دیکھنے کو دیکھنا نہیں کہتے۔ "نظارہ ساز" کی ترکیب ملاحظہ ہو جو
بتا رہی ہے کہ کسی نے نظارہ کو ایک عارضی نمود دے دی ہے ورنہ نظارے کی کوئی
اصلیت نہیں

کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں | دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

حضرت رضی بدایونی نے کہا تھا:-

جلوہ دکھا کے حضرت موسیٰ کو چھپ گئے | کیا اور کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

مگر فانی کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔

وعدے کی رات گردشِ افلاک رک گئی | جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

پروفیسر سرور کے قول کے مطابق فانی کے یہاں فکر اور جذبے کا بہت حسین امتزاج
ملتا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں سوچ کر لکھتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ جذبات کی گرمی

لہ۔ تاباں بدایونی کا شعر ہے۔

اپنی آنکھوں سے ذرا دیکھنا تاثیر قبول | تم بھی ہنگام دعائے سحری آ جانا

اور بیان کی شعریت تاثیر کا وہ طلسم پیش کر دیتی ہے کہ آدمی مسحور ہو کر رہ جاتا ہے اس کی یہ تعبیر کہ "زمانہ بگڑ گیا" شاعر کی جودت ذہن کا کمال ہے۔

دے ان کو جان جس کو غرض ہو کہ دل کے بعد
ان کی نگاہ کا وہ تقاضا نہیں رہا

محبوب کی ادائیں دل لیتی ہیں۔ جان لینا ان کا کام نہیں۔ یوں کسی (عاشق) کو غرض پڑے اور جاں نثار کرنے ہی پر تلا ہو تو اس کو اختیار ہے، جس کو غرض ہو، سے جو بے نیازی ظاہر ہے وہ لطف سے خالی نہیں۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک

مثل ہے کہ بات سے بات یاد آتی ہے۔ دوسرا کوئی شاعر کہتا تو یوں کہتا کہ جب تیری جوانی کا ذکر چھڑا تو قیامت کے فتنے یاد آ گئے۔ مگر فانی روش عام پر چلنا اپنی وضع کے خلاف خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قیامت ادنا ہو اور ادنا سے اعلا (جوانی) تک انتقال ذہن کے ساننے کی بات ہے۔

کس سے اب درد کی دوا چاہوں
درد اُٹھتا ہے لے کے تیرا نام

مصرع ثانی کے دو پہلو ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ درد بھی تیرا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تیرا نام لیتے ہوئے (دل میں) درد اُٹھتا ہے۔ جب مرض اس حد کو پہونچ گیا تو علاج کیوں کر ممکن ہے۔

نزع میں فانی چپکے چپکے تو نے یہ کس کا نام لیا
کیوں او کافر تیری زباں پر اب بھی خدا کا نام نہیں

شعر کیا ہے ایک مرقع حسرت ہے۔ عاشق دم توڑ رہا ہے۔ تیمار دار آس پاس بیٹھے ہیں۔ عاشق کی زبان پر آہستہ آہستہ کسی کا نام آتا ہے۔ (آہستہ اس لئے کہ راز محبوب رسوا نہ ہو جائے) تیمار دار سمجھ جاتا ہے۔ کیوں کہ اگر خدا کا نام ہوتا تو اس کے چھپانے کی کیا ضرورت تھی اور بے ساختہ پکار

اُٹھتا ہے۔ ع

کیوں او کافر تیری زباں پر اب بھی خدا کا نام نہیں

کہتے ہیں کہ کسی محفل میں جوشؔ موجود تھے جس وقت فانیؔ نے یہ مقطع پڑھا تو جوشؔ بے چین ہو گئے اور بول اٹھے۔ "فانیؔ یہ مقطع بار بار پڑھے جاؤ، طبیعت کو سیری نہیں ہوتی۔" فانیؔ کے یہاں کہیں کہیں معاملہ بندی کے اشعار ہیں مگر ابتذال سے پاک اور فطرت کے مطابق۔

وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آتی
وہاں ان کے نہ آنے تک لبریز شکایت تھا

ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی
نہ بن پڑا کوئی عذر جفا کسی سے تو ہائے

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

چند اشعار بغیر کسی تشریح کے سنیئے۔

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہو
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

اُبھری ہوئی ہے چوٹ دلِ زار مند کی
رکھنا قدم تصورِ جاناں سنبھال کے

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

پڑتا نہیں اس آئینہ میں عکس کوئی اور
دل میں تری تصویر سی رکھ دی ہے کسی نے

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم
کہ جنازے پہ وہ غارت گر خواب آتا ہے

زباں کٹتی ہو تو کہ آشیاں پر
تمنا بھی بہت تھی آشیاں کی

فانیؔ کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے
کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رویا

لو تبسم بھی شریک نگہ ناز ہوا
آج کچھ اور بڑھائی گئی قیمت میری

(ب) غم: —— ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ فانیؔ کی

شاعری میں غم کا عنصر اسی طرح غالب ہے جس طرح ریاض کے یہاں خمریات کا۔ فرق یہ ہو کہ ریاض نے کبھی شیشے کی پری کو منھ نہیں لگایا۔ ان کے برخلاف فانی نوجوانی سے لے کر آخر عمر تک غم سے دوچار رہے۔ غم دوراں ہو یا غم جاناں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ان کی ہستی پیکر آلام رہی۔ جب یہ واقعہ ہے تو ان کے کلام میں غم کی ترجمانی پر چیں بہ جبیں ہونا یا نکتہ چینی کرنا کہاں تک حق بجانب ہے۔ بعض نے ان کو یاسیات کا امام ٹھہرایا اور بعض نے انھیں بوڑھ عالم۔ سوز خواں۔ ہر وقت بسورنے والا۔ اور انسانیت سے گرا ہوا بتایا۔ مگر وہ تحسین اور طعن دونوں سے بالا تھے۔ نہ اس کا شکر نہ اس کی شکایت۔

نہ غم آزردن عصائے نہ شادی داد سامانے
بہ پیش ہمت ما ہر کہ آمد بود مہمانے

اس مسئلہ پر ہم تفصیل سے دوسرے باب میں ذکر کر آئے ہیں۔ اس موقع پر یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ غم کا بھی نظام عالم میں ایک مقام ہے۔ شیلی نے خوب کہا ہے کہ ہمارے سب سے شیریں نغمے وہ ہیں جو غم کے ساز سے نکلے ہیں۔ طربیہ کے مقابلہ میں المیہ کی برتری کا یہی راز ہے۔ پروفیسر مسعود حسن کہتے ہیں "غم شاعری کے لئے خوشی سے کہیں بہتر موضوع ہے۔ اس لئے کہ خوشی انسان کے پست جذبات کو متحرک کرتی ہو اور غم بلند ترین حیات کو بیدار کرتا ہے[1]۔"

اگر یہی ہوتا تو بھی مضایقہ نہ تھا لیکن فانی نے ایک قدم آگے بڑھایا اور غم کو ماحصل حیات کر دکھایا۔ ان کی شعریت کی بدولت (جس کی جڑیں ان کی روح کی گہرائیوں تک پہونچی ہوئی تھیں) وہی غم جس سے انسان گھبراتا ہے عین مسرت اور وہی موت جس سے دنیا کانپتی ہے حاصل زندگی بن گئی۔ در اصل یہ کہنا کہ انھوں نے غم کی ترجمانی کیوں کی یا مثلاً اصغر نے نشاط کے ترانے کیوں چھیڑے، ایک

---

[1] ہماری شاعری پروفیسر مسعود حسن رضوی

فطری شاعر کو لایعنی پابندیوں میں اسیر کرنا ہے دیکھنا صرف یہ ہو کہ جو کچھ انہوں نے کہا اس میں خلوص ہے یا نہیں اور ان کا کلام حسن شعر سے متصف ہے یا نہیں۔ خود فانی نے ایک ریڈیائی تقریر میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ "شعر کے لئے پہلی اور آخری شرط شعریت ہے اور شعر کا حاصل خود شعر ہے"۔ اس میں اس اعتراض کا جواب بھی آجاتا ہے کہ جب وہ یاسیات کے امام ہیں تو ہمیں ان کی اقتدا سے کیا فائدہ۔ اگر فائدے سے کوئی مادی نفع مراد ہے تو فانی سرے سے اس کے قائل ہی نہیں۔ ان کی زندگی ہمیشہ مادی نفع کی جستجو سے بالا رہی۔ آپ اس سے کسی مادی منفعت یا عملی پیغام کی توقع ہی کیوں رکھیں کیوں کہ وہ شاعر ہیں ر خادم نہیں ہیں۔ لیکن اگر فائدے سے وہ حالی یا نہتی حظ مطلوب ہو تو اس کی ان کے یہاں کمی نہیں۔ کلیم الدین نے فانی کی تعریف کی ہے مگر اس کے ساتھ ہی ان کو شکایت ہے کہ "غالب کی دنیا وسیع اور فانی کی دنیا تنگ ہے"۔ مجنوں بھی ان کے مسلسل شیوۂ فریاد کا شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ" ان کی شاعری میں ایک تھکا دینے والی یکسانیت پیدا ہو گئی ہے"۔ ہمارے نزدیک ان دونوں صاحبوں کے اعتراضات غیر صحیح ہیں۔ راقم نے اپنے مقالہ میں جو مومن کی حیات و شعر سے متعلق رہے تفصیل سے بتایا ہے کہ غالب کے مقابلے میں مومن کی دنیا محدود سہی لیکن ان کی غیر معمولی طباعی نے عشق کے محدود موضوع میں وہ حیرت انگیز تنوعات پیدا کئے ہیں کہ ان کے کمال پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ تھکا دینے والی یکسانیت کا اعتراض بھی چنداں وقعت نہیں رکھتا۔ بلکہ ان گنے چنے موضوعات پر جو فانی کو محبوب ہیں ان کی رنگارنگ نادرہ کاری دیکھ کر قاری ایک تحیّر آمیز مسرت محسوس کئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ درست ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں اشاید

لکھنؤ کے قیام کے اثر سے) کہیں میت، کفن اور جنازے کا ذکر ملتا ہے لیکن ایسے اشعار ان کے دیوان میں بہت کم ہیں اور بعد کو وہ اس رنگ سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس رنگ کے چند شعر سنیئے :-

چلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ — تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید — کچھ اب کی بوئے کفن دامن بہار میں ہے

لو آئیں گے وہ تب بھی دم نکل ہی جائے گا فانی
مگر مشکل سے نکلے گا بڑی مشکل سے نکلے گا

بچھڑنے کی مفارقت۔ فانی — لے مبارک ہو موت کا آغوش

دم بخود سکتے کا عالم مردنی چھائی ہوئی — رنگ میری زندگی کا میری میت پر کھلا

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلد ہی اس کوچہ سے نکل آئے۔ ان کے بعد کے کلام میں میت، کفن کا بھیانک اور ناگوار تصور نہیں ملتا۔ بلکہ موت اور غم کا وہ نکھرا ہوا اور بلند تصور ہے جس کو تغزل کی جان کہنا چاہیے۔ اس تصور کی کیا نوعیت ہے آگے ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر جذبی نے کسی جگہ فانی کے حوالے سے بتایا ہے کہ ان کے یہاں غم سے مراد صرف رنج یا دکھ نہیں بلکہ وہ عشق کا مترادف ہے۔ کیونکہ عشق کے درد و سوز کے اظہار کے لئے غم کی اصطلاح نہایت موزوں ہے یہ صحیح ہے کہ فارسی اور اردو میں غم کا لفظ عشق کے معنی میں بھی آیا ہے۔ مثلاً

حافظ۔ غم حبیب نہاں بہ زگفت و گوشے رقیب — کہ نیست سینۂ ارباب کینہ محرم راز

غالب۔ در عرض غمت پیکر اندیشہ لالم — یا تا سرم انداز بیانست و بیاں نیست

لہ۔ خود فانی نے ایک جگہ غم کو وسیع معنوں میں کشاکش حیات کے لئے استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

غم راز ہے ان کی تجلی کا جو عالم بن کر عام ہوا — دل نام ہے ان کی تجلی کا جو راز رہی عالم نہ ہوئی

میرؔ: اس آئینہ کی مانند زنگار حسرت کو کھا دے ... کام اپنا اس کے غم میں دیدار تک پہونچا!

مگر ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔ فانی لکھتے ہیں :-

غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی ... کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

طول روداد غم معاذ اللہ ... عمر گذری ہے مختصر کرتے

بے شک انسان بشریت کے تقاضے کے باعث غم سے گھبراتا ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ غم سے دل مانوس ہو جاتا ہے۔ اور وہی غم زندگی بن جاتا ہے۔ یہی حال فانی کا ہے۔ غم ان کا سہارا ہی نہیں، ان کا محبوب ہے اور موت ان کو گوارا ہی نہیں، ان کی مطلوب ہے۔ کیوں؟

۱۔ غم یاد دوست کا ذریعہ ہے ۲۔ ہر چہ از دوست می رسد نیکو ست

۳۔ ٹوٹے ہوئے دلوں پر خدا کی خاص نظر ہے ۴۔ غم کو انعام الٰہی سمجھنا چاہیئے

۵۔ دراصل غم کے بغیر دل جو عرش الٰہی کہلاتا ہو دل ہی نہیں ہوتا۔

اس طرح :-

(۱) موت کا تصور دنیا کے علائق کا علاج ہے۔

(۲) موت زمانے کے مصائب سے نجات دہندہ ہے :-

(۳) اس کے بغیر حقیقی زندگی (وصال دوست) حاصل ہونا محال ہے۔

(۴) زیست بے وفا ہے مگر مرگ حق رفاقت ادا کرتی ہے :-

(۵) موت اہل عشق کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔

مثالوں سے یہ بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے ... ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

زہے تقدیر ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھہری ... تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو ... میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

فانی سکونِ موت نے دل سے مٹا دیا | وہ نقش بے قرار کہ دنیا کہیں جسے
آج روزِ وصالِ فانی ہے | موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز
موت ہی ساتھ دے تو دے فانی | عمر کو عذر بے وفائی ہے
لذتِ ناگفتنی تھیں یعنی | دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے

میتھیو آرنلڈ کا قول ہو کہ شاعری ایسی تنقیدِ حیات ہے جو قوانینِ حسن و صداقت کے تابع ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تعریف فانی کی شاعری پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے زندگی کے مسائل پر تبصرہ جس طرح انھوں نے کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ پھر اس حسن اور شعریت کے ساتھ کہ بڑے سے بڑے مخالف کو بھی ماننا پڑے گا کہ وہ خشک سے خشک مضمون میں اپنے انداز سے جو ان کا اپنا ہے جان ڈال دیتے ہیں۔ رہی صداقت، اس کے بارے میں یہ امر ملحوظ رہے کہ ان کی شاعری اور ان کی زندگی میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ جو کچھ واقعی محسوس کرتے ہیں وہی ان کی زبان و قلم پر آتا ہے۔ غم اور اس کے متعلقات پر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ ہماری زبان کا شاہ کار ہے۔ مثالیں ان کے دیوان میں بکثرت پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر طولِ کلام کے ڈر سے ترک کرنا پڑیں۔

(ج) تصوف :——— فانی نہ تو صوفی تھے نہ کسی شیخ طریقت سے بیعت کی نوبت آئی۔ ان کا ماحول بھی تصوف سے بیگانہ تھا۔ خود ان کے والد کے بارے میں کہا جاتا ہو کہ وہابیت کی طرف مائل تھے۔ وہابیت اور تصوف میں کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ ان کا تصوف روایتی نہیں تھا انھوں نے تصوف کا مطالعہ کیا اس پر فکر کی اور اس کو اپنی زندگی کا جزو بلکہ کل بنالیا۔ یہ حقیقت کو معشوق یکتا مے صفات ہی میں یکتا نہیں، وجود میں بھی لاشریک ہے۔ جلوۂ یکتائی معشوق کے سوا دہر میں کوئی اصل نہیں۔ تمام کائنات ایک آئینہ ہے

جس میں وہ اپنے جمال جہاں آرا کا مشاہدہ کرتا ہے خصوصاً ایک شاعر پر جب یہ حقیقت حال بن کر چھا جاتی ہو تو اس کے ذوق و شوق۔ جذب و مستی کی حد نہیں رہتی۔ رومی ہوں یا عراقی، حافظ ہوں یا جامی۔ سب اسی میں مست نظر آتے ہیں۔ فانی بھی اس زمرے میں نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں صوفیانہ موضوعات میں جو گہرائی اور تاثیر پائی جاتی ہے وہ کم شعرا کے یہاں ہے۔ مثلاً لاموجود الا اللہ تصوف کا نقطہ آغاز و انجام ہے جس پر لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ فانی کو بھی سنیے

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے   کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

وہ ہمیں ملتے تو جب کہ ہم اس سے الگ ہستی رکھتے ہوں۔

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی   وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا
کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا   یہ راز ہے کہ کوئی رازداں نہیں ملتا
مراد جو ہے میری نگاہ خود نشناس   وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا

عاشق کی نگاہ جلوہ گاہ معشوق کے سوا کچھ نہیں،

میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا   اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

لوگ کائنات کو مجاز اور ذات دوست کو حقیقت کہتے ہیں۔ فانی کو یہ دوئی بھی گوارا نہیں۔

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرق مجاز و حقیقت کیا
یہ عرض حقیقت ہے وہ حقیقت ہستئ باطل کوئی نہیں

ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

ہر کوئی شے تو یاد جلوۂ یار   وہ حقیقت ہو اور یہ اصل مجاز

مجاز نہیں کہا بلکہ اصل مجاز کہا۔ یعنی جس کو دنیا مجاز کے نام سے یاد کرتی ہو اس کی بنیاد جلوۂ یار ہے اس پر بھی ان کو اطمینان نہ ہوا تو کہا۔

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے   تو حقیقت ہو اور تو ہی مجاز

صورت منصور و طور ارے توبہ   ایک ہے تیری بات کا انداز

جانتا ہوں حقیقت باطل   ماسوا تو ہے ماسوا کی قسم

ایک موقع پر نہایت نادر انداز میں بے خودی اور خودداری دونوں کی منزل ایک ہی بتائی ہے۔ اول الذکر حقیقت کی تلاش میں اپنے آپ کو کھو بیٹھتا ہے، اور آخرالذکر یہ سمجھ کر کہ میں اس کا 'عین' ہوں اس کو پا لیتا ہے۔

ترک خودی ہو ہوش عشق، درک خودی ہے جوش عشق

خود ناشناس و خود شناس جو ہے خدا شناس ہے

جب ایسا ہے تو پھر یہ کائنات اور خود ہم کیا ہیں۔ اس کا جواب ملاحظہ ہو

آدمی میں کچھ نہیں۔ آپ نے سمو دیا   عالم غبار کو عالم خیال میں

ابتدائے زندگی۔ انتہائے زندگی   آپ کے خیال سے آپ کے خیال میں

صوفیہ اسی بات کو اپنی زبان میں اعیان ثابتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ آخر اس تمام کارخانے کی نمود کی کیا مصلحت تھی۔

عرض نیاز راز ہے کثرت مجاز کا   آئنے سے لگ گئے پرتو جمال میں

آخر زمانہ آئینہ دکھلا کے رہ گیا   لانا پڑا انھیں کو تمھاری مثال میں

آخری شعر فانی کی آیات کمال میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ ایسے دقیق مفہوم کو اتنی بھرپور شعریت کے ساتھ ادا کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ یہ خیال رہے کہ شعریت کسی نپے تلے پیمانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ذوقی چیز ہے جس کے بارے میں آخری بات جو کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

فانی نے جو سرمایۂ شعر چھوڑا ہے وہ زیادہ نہیں ہے۔ تاہم اگر وہ بھی نہ ہوتا تو

ایسے اشعار ہی ان کی بقائے نام کے لئے کافی تھے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم محبوب حقیقی کے حسن کا تصور کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں حسن کا نصب العین کوئی خوب صورت انسان ہوتا ہے۔ یا جب اس کی عظمت کا خیال کرتے ہیں تو ہماری نظر میں کوئی عظیم الشان جبار شہنشاہ ہوتا ہے تو قطع نظر اس امر کے کہ وہ شائیں ہماری محدود عقل ہی کی تخلیق ہیں، ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جو پیمانے ہمارے سامنے ہیں وہ بھی تو اسی کی صفات کمال کا ادنا پرتو ہیں۔

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں آواز آرہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی

شاید افلاطون پہلا شخص ہے جس نے اس راز سے پردہ اُٹھایا کہ ہمیں اس محدود زندگی میں کلیہ کا تصور کیوں کر حاصل ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ عالم ناسوت میں آنے سے پہلے روح انسانی کو ایک ایسے عالم سے سابقہ رہا ہے جہاں اس کو حسن مطلق خیر محض اور حق کلی کا مشاہدہ میسر تھا۔ اسی کی یاد دنیاوی زندگی میں رہ رہ کر آتی ہے۔ ورنہ یہاں ان کلی تصورات کا وجود کہاں۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ ایک تشبیہ پیرائے میں ادا کرتے ہیں:

مجھ پہ الزام پرستارئ صورت کیا خوب خود تری یاد ہی صورت گر آغوش ہوئی

دنیا (عالم مادی) کی حقیقت۔ رقص اور صورت کدہ سے ذہن نامانوس خیال کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

یہ تو معلوم نہیں کیا ہے یہ دُنیا لیکن صرف صد رقص ہو صورت کدۂ جاں کوئی

اس زندگی میں وصال ممکن نہیں۔

زحمت ایک نظر کے بعد حوصلہ دعائے وصل کیوں دل قدر ناشناس اب یہ مجال ہوگئی

کہتے ہیں کسی مجذوب نے علامہ اقبال سے پوچھا کیا چاہتے ہو؟ دولت، عزت۔

اقبال نے انکار کیا۔ پوچھا کیا وصال چاہتے ہو؟ جواب دیا میری یہ جراءت نہیں (کہ اس کی مصلحت میں اپنی مرضی کو دخل دوں)۔ دنیا والوں کو ذرے تو نظر آتے ہیں صحرا انہیں دکھائی دیتا۔

اللہ رے چشم ہوش کی کثرت پرستیاں ذرے ہی رہ گئے کوئی صحرا نہیں رہا

خدا کی جانب سے ہر لحظہ ہمیں فیضانِ وجود ہوتا رہتا ہے۔

میری ہستی گواہ ہے کہ مجھے تو کسی وقت بھولتا ہی نہیں

اگر اس کا جمال بے حجاب ہو جائے تو پھر ہم کہاں۔

تعینات کی حد سے گذر رہی ہے نگاہ بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

بعض صورتوں میں کفر بھی ایمان بن جاتا ہے یعنی ماسوا سے انکار۔

عشق وہ کفر کہ ایمان ہو دل والوں کا عقل مجبور وہ کافر جو مسلماں ہو جائے

نظیری بھی اس کفر کے قائل ہیں۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

اصغر نے بھی اپنے رنگ میں یہی خیال پیش کیا ہے۔

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی کچھ قید رسم نے جسے ایماں بنا دیا

(د) اسرار کائنات پر لمحۂ فکریہ :۔ —— یہ کہنا تو مشکل ہے کہ فانی کے یہاں تصوف عشق کی راہ سے آیا یا فلسفہ کی۔ لیکن اسرار کائنات پر نظر تصوف ہی کی عینک سے دیکھنا شروع کیا۔ جہاں جہاں ان کو ذہنی الجھن پیش آئی اسی نقطۂ نظر سے ان کی گتھی سلجھائی اور ان اسرار کی نقاب کشائی میں ان کی مدد کی۔ وہ ایک سوچنے والا دماغ اور ایک شاعرانہ طبیعت لے کر آئے تھے انھیں دونوں کی کارفرمائی ان کے کلام میں برابر نظر آتی ہے۔ مثلاً :۔

۱۔ جبر و قدر : —— فلاسفہ اور اہل مذہب کی پرانی بحث صدیوں سے

چلی آرہی ہے کہ انسان مجبور ہے یا مختار۔ دونوں نے اپنی تائید میں دلائل کے انبار لگا دئے ہیں۔ چونکہ فانی کو تصوّف سے غیر معمولی مناسبت ہے اور تصوّف کائنات اور انسان کی ہستی کی مستقل حیثیت نہیں مانتا۔ اسی نسبت سے انسان کے افعال بھی مستقل وجود نہیں رکھتے۔ اس لئے قدرتاً ان کا میلان جبر کی طرف ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ان کو جبر کا عقیدہ نہایت مرغوب ہے۔ جبر کو ثابت کرنے کے لئے فانی نے نئے نئے پہلو اور انوکھے پیرائے تلاش کئے ہیں جو ان کی ژرف نگاہی کی جولانگاہ کہے جا سکتے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ خشک فلسفیانہ نظریات میں شعریت اسی طرح سمو دی ہے کہ بڑے سے بڑے منکر کو بھی اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ہم کو یہ آزادی ملی ہے کہ اپنے راستہ کا تعین خود کر سکیں۔ لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہمارا کسی خاص راستہ پر گام زن ہونا کئی پہلے سے طے شدہ عوامل (وراثت۔ خارجی اثرات وغیرہ) کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فانی کہتے ہیں۔

گلشنِ تصویر میں نغمے طائرِ تصویر ہم ۔۔۔ کیا کہیں کیوں کر رہے مجبور بھی آزاد بھی

طائرِ تصویر دیکھنے میں تو پرواز میں ہے مگر جیسی پرواز کر رہا ہے وہ معلوم ہے۔

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں ۔۔۔ ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا ۔۔۔ آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

مجبوریِ ٔعریاں کو یہ خلعتِ مختاری ۔۔۔ اللہ رے کرم ہم اور توفیق گنہ گاری

یہی خیال شاعر کو اکساتا ہے کہ خدا کے حضور میں اپنی لغزشوں کا عذر پیش کرے

دو گھڑی کے لئے میزانِ عدالت ٹھہرے ۔۔۔ کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے۔ خدا سے پہلے

بخش دے جبر کل کے صدقے میں ۔۔۔ ہر گنہ میری بے گناہی کا

فطرت اختیار۔ حشر کے دن ۔۔۔ آسرا ہے تری گواہی کا

فوراً متنبہ ہوتا ہے اور کہہ اُٹھتا ہے۔

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی　　سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

زنجیر اور وہ بھی دوست کے ہاتھ کی باندھی ہوئی۔ اس کا شکوہ کس منہ سے کیا جائے

جبر کو کیوں کر نہ سمجھوں اختیار　　تم نے باندھا ہو جسے زنجیر سے

۲۔ تقدیر و تدبیر :۔ ــــــــ اوپر والے قضیہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہماری تدبیریں تمام تر مشیت الٰہی کی پابند ہیں۔ جیسا کہ حکیم امت حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب کو فسخ عزائم سے پہچانا۔ مگر فرق یہ ہے کہ وہ تقدیر کی پابندی کے ساتھ تدبیر سے غافل نہیں تھے اور ہم تقدیر کے تو قائل ہیں مگر تدبیر سے غافل۔ بہرحال فانی کہتے ہیں۔

حسن تدبیر نہ رسوا ہو جائے　　راز تقدیر الٰہی کو نہ پوچھ

یعنی اگر تقدیر کی حقیقت ظاہر ہو جائے تو تمام دنیا عمل سے ہاتھ اُٹھا لے۔

تقدیر جب تک راز میں ہے تدبیر کی بخشش باقی ہے

جب میں نے دعا کا رُخ کئے فلک دیکھا　　تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی

کام اب اس تدبیر پر ہے منحصر　　واسطہ جس کو نہ ہو تقدیر سے

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو　　اک جنازہ جا رہا ہو دوش پر تقدیر کے

۳۔ گناہ و بخشش : ــــــــ یہی خیالات ہیں جن سے گناہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ مگر فانی نے دوسروں کے برخلاف سرکشی۔ گناہ پر اصرار اور ذات باری سے گستاخی کی راہ کبھی اختیار نہیں کی۔ بلکہ بخشش کے لئے ایسے ایسے پہلو ڈھونڈھے کہ بعید نہیں جو رحمت کو بھی جوش آ جائے۔

کیا ہے خلق مجھے باوجود علم گناہ　　یہ ابتدا ہی کرم کی تو انتہا کیا ہے

امید عفو ہو ترے انصاف سے مجھے　　شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

تیری قدرت کا نظارا ہے مرا عجز گناہ
تیری رحمت کا اشارہ ہو ندامت میری

اللہ اللہ وہ رحمت ہو خطا کار وں پر
جو خطا ہونے سے پہلی ہی خطا پوش ہوئی

اچھا یقین نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم۔ خدا بھی ہو

یہ مسلم ہے کہ ایک شاعر اور اچھے شاعر کے یہاں اسلوب یا اسٹائل خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسٹائل ہی اس کی شخصیت کا بھرپور اظہار ہے اور یہی اس کی شخصیت کو پہچاننے میں مدد دیتا ہے۔ فانی کا اسٹائل انفرادیت کے ساتھ جو ندرت اور دل آویزی رکھتا ہے وہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہوئی ہوگی۔ اس کے علاوہ زبان پر ان کی غیر معمولی قدرت۔ الفاظ و تراکیب کا برمحل استعمال۔ جدید فارسی تراکیب کا اختراع۔ ایسے اوصاف ہیں جنھوں نے نہ صرف ان کی شاعری کی دل کشی بلکہ معنویت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ لیکن اس بحث کا یہاں موقع نہیں ہے۔

ضمیمہ اوّل

فانی کی انفرادیت کہیے یا جدّت پسندی کہ انھوں نے زبان و بیان میں نئے راستے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مخصوص تراکیب۔ الفاظ کے مخصوص انداز نے ان کی شاعری میں ایک نیا اور دلپذیر رنگ پیدا کر دیا ہے جو ایک طرف ان کی قدرتِ بیان کی دلیل ہے اور دوسری طرف وسعتِ زبان کا ضامن۔ ہمارا ذیل کا مطالعہ ان کی خوبیوں یا خامیوں کی طرف متوجہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس جائزہ سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ انھوں نے کس طرح کس ترکیب یا لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس ضمیمہ کی تکمیل میں صفحات کے حوالے کلیاتِ فانی، شہزاد بک ڈپو ترکمان گیٹ دہلی سے دیئے گئے ہیں جو اکتوبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس جائزہ میں صرف غزلیات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس امر کا افسوس ہے کہ کلیاتِ فانی کے اس ایڈیشن میں صفحات کے نمبر بے ترتیب ہو گئے ہیں اس لئے یہاں بھی انہی بے ترتیب صفحات کے حوالے دیئے جا رہے ہیں۔ حیدرآباد کا مطبوعہ نسخہ بھی اس عیب سے بری نہ تھا۔

تراکیب	مصرع ہائے غزلیات	صفحہ
	(الف)	
آزردۂ آویزشِ شبنم	آزردۂ آویزشِ شبنم نہ ہوا تھا	۴۷
آزردۂ وہمِ مسرت	میں آزردۂ وہمِ مسرت ہوں معاذاللہ	۴۸

(ب)

(پ)

جلوۂ نظارہ ساز	منھ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا	
جواب بے سوال	جواب بے سوال ہوں سوال بے جواب کا	۵۵
جنونِ شکوۂ بے داد	جنونِ شکوۂ بے داد پہ خدا کی مار	۵۵
جبرِ گل	بخش دے جبرِ گل کے صدقے میں	۵۰
جلوہ گہِ کیفِ صد بہار	ہر روئے گل کہ جلوہ گہِ کیفِ صد بہار	۸۹
جستجوئے نشاطِ مبہم	جستجوئے نشاطِ مبہم کیا	۹۲
جولاں گہہ برقِ فنا	سینۂ فانی ہے یا جولاں گہہ برقِ فنا	
جلوۂ جلوہ ساز	جلوہ جلوہ ساز ہیں ہم لوگ	۱۲۵
جادہ ان بے آغاز	حسن ہے جادہ ان بے آغاز	۱۲۹
جنونِ چارۂ وحشت	جنونِ چارۂ وحشت مگر نہیں ہے مجھے	۲۲۵
جبرِ دوست	محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا	۲۵۵

(چ)

چراغِ کشتۂ آرام گاہِ بے نشانی	چراغِ کشتۂ آرام گاہِ بے نشانی ہوں	۱۳۲
چشم و چراغِ جنوں	گل تک جو ہاتھ چشم و چراغِ جنوں رہا	۱۲۸
چرخِ بے پروا خرام	ہوشیار او چرخِ بے پروا خرام	۲۳۸
چشمِ سر بسر تسخیر	وہ چشمِ سر بسر تسخیر کافر ہوتی جاتی ہے	۲۸۶

(ح)

حسرت زدۂ نوش	میں تری بزم میں حسرت زدۂ نوش نہ تھا	
حدِ امکانِ تمنا	جا اور حدِ امکانِ تمنا سے گزر جا	۴۵
حاملِ آثارِ جنوں	چشمِ تر حاملِ آثارِ جنوں ہے فانی	۴۵
حسنِ جلوہ ساز	عشق بن گیا آخر حسنِ جلوہ سازاں کا	۴۹

حریف زوالِ غم	دل حریفِ زوالِ غم نہ ہوا	۷۹
حسنِ عتابِ یار	فانی اب اپنی زندگی حسنِ عتابِ یار ہے	۹۱
حیاتِ مرگ نواز	تو نے بخشی حیاتِ مرگ نواز	۱۱۸
حرفِ داستانِ انجام	حالِ دل حرفِ داستانِ انجام	۱۲۹
حرفِ بے معنیٔ فنا	حرفِ بے معنیٔ فنا کی قسم	۱۳۱
حوصلۂ ذوقِ تماشا	پست کر حوصلۂ ذوقِ تماشا کہ ہنوز	۱۳۷
حریف زوالِ غم	دل حریفِ زوالِ غم نہ ہوا	۱۴۰
حسرتِ تاثیرِ درد	ہاں نہیں شرطِ مروت حسرتِ تاثیرِ درد	۱۴۲
حسن جفا پسند	حسن جفا پسند سے حسرتِ عرضِ شوق کیا	۱۴۴
حسرتِ عرضِ شوق	حسن جفا پسند سے حسرتِ عرضِ شوق کیا	۱۴۴
حریفِ گریۂ بے اختیار	حریفِ گریۂ بے اختیار ہم بھی ہیں	۱۵۲
حسابِ حسرتِ جرمِ نظارہ	حسابِ حسرتِ جرمِ نظارہ دل سے پوچھ	۲۰۲
حاصلِ بے خبری	حاصلِ بے خبری لازمۂ ہوش ہوئی	۲۰۳
حوصلۂ دعائے وصل	رخصتِ یک نظر کے بعد حوصلۂ دعائے وصل	۲۱۴
حسنِ بے تماشا	اکتسابِ غم کروں حسنِ بے تماشا سے	۲۲۸
حریفِ تجلی	یہ دل حریفِ تجلی ہی کیوں بنایا تھا	۲۴۶
حجابِ زعمِ تماشا	حجابِ زعمِ تماشا اٹھا تو کچھ دیکھوں	۲۶۲
حسن تماشا ریز	یاں نقابِ جلوہ خود حسن تماشا ریز ہے	۲۷۲
حسنِ ستم نواز	حسنِ ستم نواز کی ایک نگاہ غم نواز	۲۷۳
حریفِ سوزِ نہاں	حریفِ سوزِ نہاں تو نہیں مگر پھر بھی	۲۷۷
حسرتیٔ موت	مایوس بھی حسرتیٔ موت ہوں فانی	۲۷۸

(ش)

طلسم فیض	اک طلسم فیض ہے سینے میں سوزِ دل کی ذات

(ع)

عبرت سرائے دل	عبرت سرائے دل میں ہوں آوارۂ نہ رباش
عذر بے تقصیر	کیا مزے کا ہے تقاضا عذرِ بے تقصیر کا
عالمِ امکان تمنّا	دنیا ہے مری عالمِ امکانِ تمنّا
عقلِ کج فہم	عقلِ کج فہم نے دیوانہ بنانا چاہا
عزیزِ خاطرِ نامہربانِ سخت جانی	عزیزِ خاطرِ نامہربانِ سخت جانی ہوں
عہدِ دل فریبئ تاثیر	وہ عہدِ دل فریبئ تاثیر اب کہاں
عیشِ غم انجام	ہم مفت بھی یہ عیشِ غم انجام نہ لیتے
عشرتِ تجلّی	عشرتِ تجلّی کی لذتیں ذرا ٹھہریں
عشقِ کارفرما	کام آ پڑا فانی عشقِ کارفرما سے
عقلِ غم فروشِ فراغت نما	اے عقلِ غم فروشِ فراغت نما ٹھہر
عیشِ خوابِ لحد	اندیشۂ عیشِ خوابِ لحد کا نہ کیجیے

(غ)

غمِ حوصلہ فرسا	چشم بد دور غمِ حوصلہ فرسا اپنا
غمِ ہستئ جاوید	ہو غمِ ہستئ جاوید گوارا کیوں کر
غم کدۂ عمرِ دوش	دل ہے وہ طاقِ غم کدۂ عمرِ دوش کا
غبارِ تمنّا	وہ پیرہن غبارِ تمنّا کہیں جسے
غبارِ رشک	غبارِ رشک خارستانِ حسرت یاس کے منظر

(ف)

فتنۂ ہر لب دآوارۂ ہر گوش	فتنۂ ہر لب دآوارۂ ہر گوش نہ تھا

گریہ ساماں
ہر تبسم کو چمن میں گریہ ساماں دیکھ کر

گم شدگان رہ غم
گم شدگانِ رہِ غم کی مثال

گریۂ محرومی دیدار
بے ادب گریۂ محرومیٔ دیدار نہیں

گوشہ گیر حلقۂ زنجیر
پھر گوشہ گیر حلقۂ زنجیر ہے جنوں

گلہ مند جفا
گلہ مند جفا نہ ہو فانی

(ل)

لطف سعیٔ عمل
لطف سعیٔ عمل، اس مطلبِ حاصل سے اٹھا

لذت کشِ آرزو
لذت کشِ آرزو ہوں فانی

لب ریز توجہ
لب ریز توجہ تھا اک خطِ پیمانہ

(م)

محشر سکوت
برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشر سکوت

معتقد حشر مجسم
میں معتقدِ حشر مجسم نہ ہوا تھا

محروم مرگ ناگہاں
یوں نہ تھے محروم مرگِ ناگہاں بیمار عشق

مضراب جنوں
پھر تو مضرابِ جنوں سازِ انا لیلیٰ چھیڑ

مطلب حاصل
لطف سعیٔ عمل اس مطلبِ حاصل سے اٹھا

ماتم کدہ فنا
ماتم کدۂ فنا ہے عالم

مجبور یک نظر
مجبورِ یک نظر آ۔ مختارِ صد نظر جا

مختار صد نظر
مجبورِ یک نظر آ۔ مختارِ صد نظر جا

مرحلہ سعی تماشا
اس مرحلۂ سعیٔ تماشا سے گذر جا

من جملۂ آداب غم خواری
گر من جملۂ آداب غم خواری ہے غم میرا

مئے مینا گداز
لا جام ساقیا مئے مینا گداز کا

(و)

(ھ)

(ی)

ضمیمہ دوم

کتابیات

۱۔ شعرالعجم — شبلی
۲۔ اردو شاعری پر اک نظر — کلیم الدین احمد
۳۔ جدید اردو شاعری — عبدالقادر سروری
۴۔ دورِ حاضر اور اردو غزل — عندلیب شادانی
۵۔ ہماری شاعری — مسعود حسن رضوی
۶۔ اُردو شاعری میں تصوّف — اعجاز حسین
۷۔ نقدِ سخن — عزیز جنگ
۸۔ کلاسکی ادب — خواجہ احمد فاروقی
۹۔ تنقیدی اشارے — آل احمد سرور
۱۰۔ شعر بہاور — مجنوں گورکھپوری
۱۱۔ مباحث و مسائل — ضیاء احمد بدایونی
۱۲۔ فانی — دیبی پرشاد
۱۳۔ فانی — مرتبہ عبدالشکور
۱۴۔ فانی — کبیر احمد جائسی

-۱۵ TITON HISTORY OF PHILOSOPHY
-۱۶ J. T. SHELLY ENCYCLOPIDIA OF LITERATURE
-۱۷ DREDLY SHAKESPEARIAN TRAGEDY

۱۔ کلیات فانی — فانی بدایونی
۲۔ عرفانیات فانی — " "
۳۔ باقیات فانی — " "
۴۔ وجدانیات فانی — " "
۵۔ انتخاب کلام میر — مرتبہ عبدالحق
۶۔ دیوان غالب — مرتبہ مالک رام
۷۔ نشاط روح — اصغر
۸۔ شعلۂ طور — جگر
۹۔ بانگ درا — اقبال
۱۰۔ پس چہ باید کرد — اقبال
۱۱۔ ارمغان حجاز — اقبال
۱۲۔ ایک خواب اور — سردار جعفری
۱۳۔ آہنگ — مجاز
۱۴۔ فروزاں — جذبی
۱۵۔ دست صبا — فیض

۱۔ علی گڑھ میگزین، فانی نمبر، سنہ ۱۹۴۳ء

۲۔ نگار (انتقاد نمبر) سنہ ۱۹ء

۳۔ نگار اپریل سنہ ۱۹۴۹ء

۴۔ نگار اپریل سنہ ۱۹۴۶ء فانی کی شاعری ظہیر الدین

۵۔ نگار جنوری سنہ ۱۹۴۱ء فانی بدایونی

۶۔ معارف مارچ سنہ ۱۹۴۵ء باقیات فانی احسان احمد

۷۔ معارف اپریل سنہ ۱۹۴۵ء عرفانیات فانی احسان احمد

۸۔ کاروان جلد ۹ نمبر ۱۔ ۵۰۔ ۸ فانی عبد الحئی

۹۔ جامعہ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء فانی کی موت عبد القیوم

۱۰۔ سب رس جنوری سنہ ۱۹۴۱ء شعر و شاعری فانی بدایونی

۱۱۔ اردو اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء فانی خالدہ شوکت

۱۲۔ ادبی دنیا شمارہ ۳ سنہ ۱۹۵۵ء فانی اور انکی شاعری خورشید محمد

۱۳۔ ساقی اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء فانی بدایونی محمد احمد سبزواری

۱۴۔ ساقی نومبر سنہ ۱۹۴۱ء فانی مرحوم ماہر القادری

۱۵۔ ساقی مارچ سنہ ۱۹۴۷ء فانی کے کلام میں لکھنوی آرٹ

انتخاب فانی

All Round best

Wish you best of luck

انتخاب کلیاتِ فانی

فصلِ گل جو یاد آئی، آشیاں بھی یاد آیا
فصلِ گل میں اُجڑا تھا شاید آشیاں اپنا
بجلیوں سے غربت میں کچھ بھرم تو باقی ہے
جل گیا مکاں یعنی تھا کوئی مکاں اپنا
نقشِ سجدہ گھبرا کر کیوں مٹائے دیتے ہو
اس میں کیا نظر آیا سنگِ آستاں اپنا

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غم گسار تھا نہ رہا
موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا نہ رہا

اب کانٹوں ہی سے کچھ لاگ نہ پھولوں سے لگاؤ
ہم نے دیکھا ہو تماشا تری رعنائی کا
لگ گئی بھیڑ یہ دیوانہ جدھر سے گذرا
ایک عالم کو ہے سودا ترے سودائی کا
پھر اسی کافر بے مہر کے در پر فانی
لے چلا شوق مجھے ناصیہ فرسائی کا

یاد ہے وہ نومیدی میں ہلکی سی جھلک امیدوں کی
ہائے وہ دل کے ویرانے پر دھوکا سا آبادی کا

یاس و اُمید سے کام نہ نکلا، دل کی تمنا دل میں رہی
ترکِ تمنا کر نہ سکے اظہارِ تمنا ہو نہ سکا

جب کسی نے لیا تمہارا نام — گریۂ بے قصد و اختیار آیا
بے قراری میں اب یہ ہوش نہیں — کس کے در پر تجھے پکار آیا
فرشِ گل پھر بچھا رہی ہے نسیم — آئیے موسمِ بہار آیا
آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو — ان کے آگے جو بار بار آیا

شکوہ منظور نہیں تذکرۂ عشق نہ چھیڑ — کہ وہ در پردہ مرا حال پریشاں نکلا
بجلیاں شاخِ نشیمن پہ بجھی جاتی ہیں — کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
حسن ہے ذات مری، عشق صفت ہے میری — ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا
مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں — رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا
زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے — ڈھونڈھتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا
تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ — آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا
اب اسے دار پہ لے جا کے سلا دے ساقی — یوں بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا
دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں — سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا
ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی — زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

کسی کے ایک اشارے میں کس کو کیا نہ ملا — بشر کو زیست ملی، موت کو بہانہ ملا
خدا کی دین ہیں ظرفِ خلق پہ موقوف — یہ دل بھی کیا ہے جسے درد کا خزانہ ملا
دبی زباں سے مرا حال چارہ ساز نہ کہہ — بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا
نشانِ مہر ہے ہر ذرہ، ظرف مہر نہیں — خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات — وہ رہ گذر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر — کیا یہ ساری عمر منت کش رہیں تقدیر کا
میرے دل سے پوچھتے ہیں آپ کیا وجہ خلش — یاد ہے گم ہو گیا تھا کوئی پیکاں تیر کا
آپکی آزردگی بے سبب بھی خوب ہے — کیا مزے کا ہے تقاضا عذر بے تقصیر کا
کس نظر سے تم نے دیکھا اپنے دامن کی طرف — کانپ اٹھا ہر ذرہ میری خاک دامن گیر کا
برق کو اب کیا غرض کیا رہ گیا کیا جل گیا — جل گیا خرمن میں جو کچھ تھا مری تقدیر کا
فکر راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی — ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا
نامرادی حد سے گذری حال فانی کچھ نہ پوچھ — ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

قربان عشق موت بھی آئی تو کیا ہوا — اس تیر بے خطا کا نشانہ خطا ہوا
طوفاں ہی ایک کیا مجھے طوفاں سے کم نہیں — لنگر ہوا سفینہ ہوا ناخدا ہوا
کیوں خون دل لگی ہی رہے گی جگر میں آگ — اے ننگ عاشقی تری غیرت کو کیا ہوا
میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا
اے جذب بیخودی ترے قربان جائیے — پھرتا ہوں دل میں کوئی مجھے ڈھونڈھتا ہوا

سنا ہے اٹھا ہے اک بگولہ جلو میں کچھ آندھیوں کو لے کر
طواف دشت جنوں کو شاید گیا ہے فانی غبار میرا

اجل کے زیر اثر ہو وہ نقش ہستی کیا — ہوا کہ برق کے سایے میں آشیانہ ہوا
ہر آن فتنہ ہے ہر فتنہ اک قیامت ہے — ترا شباب ہوا، دور آسماں نہ ہوا

ہمیں ابھی ترے اشعار یاد ہیں فانی ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا دولتِ دو جہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا
دل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا جلوۂ برقِ طور نے طور کو کیوں جلا دیا
اب مری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا
دل میں سما کے پھر گئی آس بندھا کے پھر گئی آج نگاہِ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا
اُن کے گناہ گار ہم ہیں تو مگر خطا معاف آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا

نازک ہے آج شاید حالت مریضِ غم کی کیا چارہ گر نے سمجھا کیوں زار زار رویا
فانی کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رویا

کہتا ہے غمِ یار میں ہوں جانِ تمنا دنیا ہے مری عالمِ امکانِ تمنا
مضمون تو مکتوبِ ازل کا نہیں معلوم لکھا ہے مرے خون سے عنوانِ تمنا
آہستہ گذر صرصرِ غم وادیٔ دل میں برباد نہ کر خاکِ شہیدانِ تمنا
ہے یاد تری رونقِ خلوت گہہِ خاطر ہے ذکر ترا شمعِ شبستانِ تمنا
نالے ہیں نہ آہیں، نہ خلش ہے نہ تپش ہے باقی نہ رہا کوئی زباں دانِ تمنا

پھر یاس نے رکھا ہے قدم خانۂ دل میں یعنی ہے اب اللہ نگہبانِ تمنا
جز وعدۂ باطل نہیں بنیاد کچھ اس کی دل کانپ اٹھا دیکھ کے ایوانِ تمنا

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں۔ دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی۔ کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنّا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

اللہ اللہ اک دعائے مرگ کے وہ دو اثر ۔ واں کھلا بابِ اجابت یاں قفس کا در کھلا
دیکھئے کیا گل کھلاتی ہو بہار اب کے برس ۔ خواب میں فانیؔ نے دیکھا ہے قفس کا در کھلا

حاصلِ علمِ بشر جہل کا عرفاں ہونا ۔ عمر بھر عقل سے سیکھا کئے ناداں ہونا
دل بس اک لرزشِ پیہم ہے سراپا یعنی ۔ تیرے آئینہ کو آتا نہیں حیراں ہونا
دے ترا حسنِ تغافل جسے جو چاہے فریب ۔ ورنہ تو اور جفاؤں پہ پشیماں ہونا
خاکِ فانیؔ کی قسم ہے تجھے اے وحشتِ جنوں ۔ کس سے سیکھا تم سے ذروں نے بیاباں ہونا

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گذر گیا ۔ عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا
آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیرانِ زندگی ۔ یعنی جمالِ یار کا صدقہ اُتر گیا

سایہ بھی جس پہ میرے نشیمن کا پڑ گیا ۔ کیوں آسماں وہ باغ ہی سارا اُجڑ گیا

تو نے تو اپنے کام بگڑ کر بنا لئے
میری وفا وہ کام جو بن کر بگڑ گیا

صیاد یوں پروں میں گرہ باندھتے ہیں کیا
بے درد بند بند کسی کا جکڑ گیا

بنتی نہیں ہے صبر کو رخصت کئے بغیر
کام ان کی بے قرار نگاہوں سے پڑ گیا

وعدے کی بات گردشِ افلاک رک گئی
جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ
کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے
اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا

اک حشر اور چاہیئے اس روسیاہ کو
فانی زمینِ حشر میں غیرت سے گڑ گیا

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشرِ سکوت
تیرے شہیدِ ناز کا ماتم خموش تھا

امیدِ عفو ہے ترے انصاف سے مجھے
شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

ہر قدرداں نگاہ غلط جلوہ خود فریب
عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش تھا

وحشت بقیدِ چاک گریباں روا نہیں
دیوانہ تھا جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

عشق کی دنیا زمیں سے آسماں تک شوق تھی
تھا جو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا

دل کی ہر کروٹ میں اک دنیا بنی اک مٹ گئی
ہائے ان دو خون کی بوندوں میں کتنا جوش تھا

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
زحمتِ دید چاہیئے زحمتِ انتظار کیا

خوشی سے رنج کا بدلا یہاں نہیں ملتا
وہ مل گئے تو مجھے آسماں نہیں ملتا

ہزار ڈھونڈھیے اس کا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا، وہاں نہیں ملتا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا
یہ راز ہے کہ کوئی رازداں نہیں ملتا

مجھے عزیز سہی قدرِ دل تمھیں کیوں ہو
کمی تو دل کی نہیں دل کہاں نہیں ملتا

دیارِ عمر میں اب قحطِ مہر ہے فانی
کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اُٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

جلوہ محسوس سہی آنکھ کو آزاد تو کر
قیدِ آدابِ تماشا بھی تو محفل سے اٹھا

خبرِ قافلۂ گم شدہ کس سے پوچھوں
اک بگولہ بھی نہ خاکِ رہِ منزل سے اٹھا

کس کی کشتی تہِ گردابِ فنا جا پہونچی
شورِ لبیک جو فانی لبِ ساحل سے اٹھا

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

عہدِ جدائی ختم ہوا اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
ہم بھی جیتے تھے جب تک مرجانے کا زمانہ تھا

تعینات کے حد سے گذر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

ذکر خورشیدِ قیامت سن کے واعظ کیا کہوں　　خیر اس تردامنی کی روزِ محشر دیکھنا
صبح تک فانی ہر آوازِ شکستِ دل کے ساتھ　　کیا قیامت تھا وہ تیرا جانبِ در دیکھنا

ہمیں تیری محبت میں فقط دو کام آتے ہیں　　جو رونے سے کبھی فرصت ہوئی خاموش ہو جانا

حجاب اگر من و تو کا نہ درمیاں ہوتا　　پیام حسن محبت کی داستاں ہوتا
مرادِ جو وہ ہے میری نگاہِ خود نشناس　　وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا
سکون خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار　　نہ موج بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا
تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز　　کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی　　آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

کہتے ہو کہ ہم وعدۂ پرسش نہیں کرتے　　یہ سن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا
آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت　　احباب سے غم خوار ہوا بھی نہیں جاتا

خبر اپنی مغفرت کی تو نہیں یہ جانتا ہوں　　مری توبہ چاہتی ہے درِ توبہ باز ہوتا
مرے شوق نے سکھایا اسے شیوۂ تغافل　　نہ مجھے نیاز ہوتا نہ وہ بے نیاز ہوتا

نگاہِ شوق میرا مدعا ان کو سمجھا دے　　مرے منہ سے تو حرفِ آرزو مشکل سے نکلے گا

تیری نگاہِ شوق کوئی رازداں نہ تھا　　آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا

عالم جز اعتبار نہاں و عیاں نہ تھا
یعنی کہ تو عیاں نہ ہوا اور نہاں نہ تھا
مفہوم کائنات تمہارے سوا نہیں
تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا
ہر شاخ، ہر شجر سے تھی بجلیوں کو لاگ
ہر شاخ۔ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا
اللہ رے بے نیازیٔ آداب التفات
دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا
میرے دلِ غیور کا حسنِ طلب تو دیکھ
گویا زباں پہ حرفِ تمنّا گراں نہ تھا
تو نے کرم کیا تو بعنوانِ رنجِ زیست
غم بھی مجھے دیا تو غمِ جاوداں نہ تھا
فانی فسونِ موت کی تاثیر دیکھنا
ٹھہرا نہ دل کہ جس پہ سکوں کا گماں نہ تھا

ٹوٹا طلسم ہستیٔ فانی کے راز کا
احسان مند ہوں الم جاں گداز کا
تمہید صد ہزار قیامت ہے ہر نفس
عنوان شوق ہوں گلہ ہائے دراز کا
عبرت سرائے دل میں ہوں آوارہ دور باش
مارا ہوا ہوں خاطرِ حسرت نواز کا
اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارۂ جمال
منہ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا
فانی دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں
کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

اور تسلّی سے سوا ہو گیا
دردِ جگر یہ تجھے کیا ہو گیا
موت کی نیند آگئی بیمار کو
غیب سے سامان شفا ہو گیا
اور ہی بل ہے تری زلفوں میں آج
کون گرفتار بلا ہو گیا
چارۂ تپ ہجر کا اب کیا کروں
زہر بھی کم بخت دوا ہو گیا

رگ رگ کو دردِ دل نے رگِ جاں بنا دیا
اس کفر ماسوا کو بھی ایماں بنا دیا
میری نگاہ معترفِ عجز خاک تھی
تیری نظر نے خاک کو انساں بنا دیا

غم کو بنا کے محرمِ اسرارِ کائنات ہر نقشِ غم کو پیکرِ انساں بنا دیا

خود برق ہو اور طورِ تجلا سے گذر جا خود شعلہ بن اور وادیٔ سینا سے گذر جا
بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ آئینہ اُٹھا حسنِ خود آرا سے گذر جا
اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک اس مرحلۂ سعیٔ تماشا سے گذر جا
ذرّے میں ہو گم وسعتِ صد عالمِ صحرا ذرّے کو سمجھ وسعتِ صحرا سے گذر جا
کعبہ ہو کہ ہو دَیر یہ دنیا ہو کہ عقبیٰ ہر منزل رہی جادۂ رہی جا سے گذر جا
اے عزم خبر ہوش کے پردوں کو الٹ دے اے ذوقِ نظر محملِ لیلا سے گذر جا
یوں سب کو بھلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے دنیا ہی میں رہنا ہو تو دنیا سے گذر جا
اٹھ بزمِ تحیّر سے وہ کہتے ہیں ادھر آ جا اور حدِ امکانِ تمنّا سے گذر جا

کیوں جنوں پھر نہ بیاباں میں بہار آئی ہو بڑھ چلا ہے مرے دامن سے گریباں میرا
خطرتِ عشق کی آزاد اداؤں کو تو دیکھ وسعتِ عالمِ تخیل ہے زنداں میرا

بھول جانے کے سوا اب تجھے کچھ یاد نہیں کل کی ہے بات کہ تو وعدہ فراموش نہ تھا

اسیر بند دل ہو کر غمِ دنیا سے فارغ ہوں مری آزادیوں کا راز ہے مجبور ہو جانا

بے اعتبارِ وعدۂ فردا نہیں رہا اب یہ بھی زندگی کا سہارا نہیں رہا
کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا
تم مجھ سے کیا پھرے کہ قیامت سی آگئی یہ کیا ہوا کہ کوئی کسی کا نہیں رہا

اللہ رے حشیم ہوش کی کثرت پرستیاں ذرّے ہی رہ گئے کوئی صحرا نہیں رہا

وا ہمہ کی نشق بہم کیا یاس نہ امید شادی نہ غم کیا
تم کو اس راز ما سوا کی قسم تم پہ چھایا ہوا ہے عالم کیا
ان کے آگے غم اک فسانہ ہے ان سے کہیئے فسانۂ غم کیا
عیش رفتہ کی یاد سے حاصل قصۂ خلد و ذکرِ آدم کیا
اذن ہنگامۂ نگاہ نہ دے کیا ہماری بساط اور ہم کیا
مٹ گیا نام عاشقی اب اور چاہتا ہے وہ حسن برہم کیا

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا ہم تمھارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا
غم تو واعظ غم بہشت بھی ہے امتیازِ غمِ جہنم کیا
پھر ملی غیب سے نوید نشاط غم کے ساماں ہوئے فراہم کیا

آئینہ و دل دونوں کہنے ہی کی باتیں تھیں
تیری ہی تجلی تھی اور تو ہی مقابل تھا

ہر باطل و ہر ناحق اک راز حقیقت ہے
جس شکل میں حق آیا وابستۂ باطل تھا

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پہ کرم میرا
مگر منجملۂ آداب غم خواری ہے غم میرا

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہِ محبت میں قدم میرا

رہے تقدیرِ ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھہری
تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

حال پہ میرے فرش کے ذرّے عرش کے تارے روتے ہیں
آپ کی آنکھیں تر کیا ہوتیں کوئی پلک نمناک ہوا

میرے سوا تھے اور جو پردے سارے کے سارے چاک ہوئے
یہ بھی اگر اللہ نے چاہا کوئی دم میں چاک ہوا

یہی نہ ایک حقیقت کہ بے نیاز ہے تو — دلِ غیور کو اتنی سی بات نے مارا

کیا ہوئیں داورِ محشر وہ خطائیں میری — کچھ نہیں فردِ عمل میں تری رحمت کے سوا

یہ نوعی خبر ہے عصیاں بھی ہے سزا بھی — بے ہوش بے خبر رہ بے خوف و بے خطر جا
گھبرا گیا خردگی تاریکیوں سے فانی — اے نورِ عشق دل کی گہرائیوں میں بھر جا

جھک گیا تیرے آستاں پہ جو سر — پھر کسی آستاں پہ خم نہ ہوا
اس کو میرا نصیب کہتے ہیں — جو تری زلف خم بہ خم نہ ہوا
رہ گئی حسرتِ فنا باقی — دل کو اندازۂ ستم نہ ہوا
بُت نے ہر رنگ میں خدائی کی — دل مگر دیر سے حرم نہ ہوا

دم بھی فانی کسی کے غم تک ہے　　دم نہ ہوگا اگر یہ غم نہ ہوا

ماسوا کی راہ سے جانا پڑا ہے سوئے دوست　　کفر بھی دل کی بدولت جزوِ ایماں ہوگیا
اس کے دامن سے الجھتا ہے ادب اے دستِ شوق　　یہ بھی دیوانے کوئی میرا گریباں ہوگیا
ادعائے ضبطِ غم بالکل بجا یکسر درست　　اندر جو دل کا حال چہرے سے نمایاں ہوگیا

ہر ذرہ جلوہ گاہ ہے ہر دل ہے چشمِ شوق　　اللہ رے اہتمام تماشائے یار کا
تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم　　آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا
میں نزع میں ہوں عہدِ وفا کا محل نہیں　　وعدہ نہ کر کہ وقت نہیں اعتبار کا
فانی یقینِ وعدۂ فردا کو کیا کہوں　　اب زندگی ہے نام فقط انتظار کا

بالیں پہ جب تم آئے تو آئی وہ موت بھی　　جس موت کے لئے مجھے جینا ضرور تھا
تھی ان کے روبرو بھی وہی شانِ اضطراب　　دل کو بھی اپنی وضع پہ کتنا غرور تھا

یوں نظمِ جہاں درہم برہم نہ ہوا تھا　　ایسا بھی ترے حسن کا عالم نہ ہوا تھا
پھر چھیڑ دیا وسعتِ محشر کی فضا نے　　سودا ترے وحشی کا ابھی کم نہ ہوا تھا
یا عشرتِ دوروزہ تھا یا حسرتِ دیرینہ　　وہ لمحہ ہستی جو ابھی غم نہ ہوا تھا
قاتل ہی مرا کیوں اسے کہتا ہے زمانہ　　مانا وہ شریکِ صفِ ماتم نہ ہوا تھا
پاتے ہی خجل رحم کا دریا اُمنڈ آیا　　پردہ مری آنکھوں کا ابھی نم نہ ہوا تھا
اک کفر سراپا نے کیا حشر کا قائل　　میں معتقدِ حشر مجسّم نہ ہوا تھا

ہل گئی پھر مرے دل کی دنیا — ورنہ پھر لے کے ترا نام اٹھا

آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا — میں بعنوانِ دگر یاد آیا
وہ دکھ پھر ہے مرے دل کی تلاش — خانہ برباد کو گھر یاد آیا
اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی — کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

تو نے رکھ لی گناہ گار کی شرم — کام آیا نہ انفعال اپنا
دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے — یادِ جاناں قدم سنبھال اپنا
باخبر ہیں وہ سب کی حالت سے — لاؤ ہم پوچھ لیں نہ حال اپنا
موت بھی تو نہ مل سکی فانی — کس سے پورا ہوا سوال اپنا

اک عمر پرستارِ شبِ ہجر رہا تھا — اے زلفِ سیہ ماتمِ فانی میں بکھر جا

نذر دینے لائے تھے ہم جلوۂ جاناں کو دل — وہ بھی صرفِ کشمکش ہائے تماشا ہو گیا

ردیف "ب"

عشق ہے پرتوِ حسنِ محبوب — آپ ہی اپنی تمنا کیا خوب
طلب محض ہے سارا عالم — کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب
قلب۔ ادراک۔ دماغ اور حواس — مجھ سے منسوب ہیں یا تجھ سے منسوب

ردیف "ت"

اب مجھی کو طول شامِ ہجر کا شکوہ بھی ہے — خود ہی چھیڑی تھی حدیثِ طرۂ گیسوئے دوست
آسماں کا شکر واجب ہو گلہ جائز نہیں — آسماں سے ملتی جلتی ہے جہاں تک خوئے دوست

ردیف "د"

ترا اشارہ ترا ساز برق سے نہ سہی — تجھے خبر ہے کہ جلتا ہو آشیاں صیّاد
نہ آ قریب کہ پروردۂ نشاہوں میں — بنا ہو برق کے تنکوں سے آشیاں صیّاد
بس ایک آہ جہاں سوز کے اثر تک ہیں — یہ خار۔ برق۔ قفس۔ دام۔ آسماں صیّاد
چمن میں دل ہے تو میری نگاہ میں ہو چمن — چمن سے تو مجھے لے جائے گا کہاں صیّاد
یہ جذبِ شوقِ اسیری کا ہے ورنہ اے فانیؔ — کہاں میں سوختہ دل مشت پر کہاں صیّاد

دل محشر بے خودی ہے اللہ اللہ — یاد اور کسی بھول جانے والے کی یاد
پابندیٔ رسم ہر طرف کیوں اے موت — ان کے بھی کٹے ہیں تو نے قیدی آزاد

ردیف "ر"

وہ خود اب فریبِ جمال ہے جو نظر تھی جلوہ یار پر
مجھے اب بہار سے کیا غرض کہ مری خزاں ہو بہار پر

قسمت کے حرف سجدۂ در سے مٹا تو دوں — دل کانپتا ہے شوخیٔ تدبیر دیکھ کر

نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں — سانس بن گیا اک اک نالۂ نارسا ہو کر

بڑھتا ہو نہ گھٹتا ہے مرنے میں بھی جیتے ہیں — درد پر خدائی مار دل میں رہ گیا ہو کر
زندگی سے ہو بیزار فانی اس سے کیا حاصل — موت کو منا لو گے جان سے خفا ہو کر

جلنے غم چاہے نئے جا مجھے یارب لیکن — ہر نئے غم کے لئے تازہ جگر پیدا کر
یا اسے کر کسی بجلی کے حوالے یارب — یا مرے نخلِ تمنا میں ثمر پیدا کر

اے تقاضائے خرد مجھ پہ یہ بیداد نہ کر — میں ہوں دنیائے محبت مجھے برباد نہ کر

روحِ اربابِ محبت کی لرز جاتی ہے — تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر
صبر تا یابِ محبت تو نہیں ہے لیکن — شکر اگر میں نہ پڑے شکوۂ بیداد نہ کر

یہ محشر ہے یہاں جو چاک ہے رحمت بداماں ہے
وہ دنیا تھی جو ہنستی ہی رہی ہر چاک داماں پر

اللہ رے اعتمادِ محبت کہ آج تک — ہر درد کی دوا ہیں وہ اچھا کئے بغیر
وہ جان ہی نہیں جو نہ ہو جائے نذرِ دوست — دل ہی نہیں ہے اس کی تمنا کئے بغیر

ہر تبسم کو چمن میں گریہ ساماں دیکھ کر — جی لرز جاتا ہے ان غنچوں کو خنداں دیکھ کر
شیوہ اپنا غم پرستی قبلہ اپنا خاکِ دل — روحِ غم کو پیکرِ خاکی میں انساں دیکھ کر
اس کو انعامِ خودی اور اس پہ لطفِ بیخودی — وہ کرم کرتے ہیں ظرفِ اہلِ عرفاں دیکھ کر

جی ڈھونڈھتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اُس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور

وہ پوچھتے ہیں اور کوئی دیتا نہیں جواب
کس کی وفا ہے دسترسِ امتحاں سے دور

آنکھیں چرا کے آپ نے افسانہ کر دیا
جو حال تھا زباں سے قریب اور بیاں سے دور

ہے منع راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

بنایا تھا نشیمن شاخِ گل پر کس گھڑی یارب
کہ بجھی جاتی ہے ہر برق بلا شاخِ نشیمن پر

ہنسی آتی ہے تیری سادگیِ شوق پر فانی
وہ میت ہی پہ کب آئے جو اب آئیں گے مدفن پر

ردیف "ز"

کون اُٹھائے مری وفا کے ناز
دل ستم دوست وہ رقیب نواز

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز
میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز

کھل گیا میری زندگی کا راز
اے شبِ ہجر تیری عمر دراز

صورِ منصورِ طورہ اداے توبہ
ایک ہے تیری بات کا انداز

دیکھیے کیا ہو عشق کا انجام
دل کی ہستی ہے موت کا آغاز

رہ گئی تھی جو بازوئے دل میں سکت
ہو گئی صرف ہمتِ پرواز

آج روزِ وصالِ فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

دور لے جا ہٹا کے سر حدِ ناز
دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم　　میری ہستی ہے غیب کی آواز
ہوں اسیر فریب آزادی　　پر ہیں اور مشق حیلۂ پرواز
آج اچھے نہیں الٰہی خیر　　درد کے تیور، آہ کے انداز
ہاں یہاں کوئی شے نہیں باطل　　عشق ہے راز ۔ عقل پردۂ راز

اللہ اللہ یہ شان کشتۂ ناز　　ہے مری خاک سجدہ گاہ نماز
ہاں شب ہجر آج صبح نہ ہو　　ہاں چلی جائے یاد زلفِ دراز
آج پہلو میں کیوں ہے سناٹا　　کیا ہوئی آہ آہ کی آواز

ردیف "ش"

کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت، نہ حقیقت نہ مجاز　　یہ ترا عالم مستی وہ ترا عالم ہوش

ردیف "غ"

دل کچھ نہ تھا تمھاری نظر نے بنا دیا　　دنیائے درد ۔ عالم حسرت ۔ جہانِ داغ
وہ تیری بزم تھی نہ ملی جس میں چپ کی داد　　یہ حشر ہے یہاں تو کھلے گی زبان داغ

ردیف "ک"

موت ہے ایک وقفۂ موہوم　　زندگانی سے زندگانی تک
مہربانی کی آس رہنے دے　　کون جیتا ہے مہربانی تک
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا　　بات پہونچی تری جوانی تک
نیند کھتی چشم ناز میں فانی　　ایک بے خواب کی کہانی تک

ردیف "ل"

اک حق کے سوا کوئی ہستی ہی نہ تھی یارب | یوں مرے سر آنکھوں پر تمیز حق و باطل
ہر دل میں ترا جلوہ، ہر لب پہ مرا چرچا | غم زینت صد خلوت، غم رونق صد محفل

ردیف "م"

مجھ پہ رکھتے ہیں حشر میں الزام | آنہ جائے زباں پہ تیرا نام
ضبط کی کوششیں بھی جاری ہیں | درد بھی کر رہا ہے اپنا کام
کس سے اب درد کی دوا چاہوں | درد اُٹھتا ہی لے گئے تیرا نام

میں نے گویا صلۂ ہر دو نا بجر پایا | کاش اتنا ہی وہ کہہ دیں کہ جفاکار ہیں ہم
وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی | دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہ گار ہیں ہم

دوست تسلی دینے آئے لے کے وہ اک چارہ گر آیا
لیجئے آئی زخم جگر پر اور اک تازہ آفت مرہم
ڈوب ہی جا اے کشتی ہستی کچھ تو ہو آخر ورنہ کہاں تک
بحر تلاطم خیز جہاں میں یونہی رہیں گے زیر و زبر ہم

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم | رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم
دعا تو خیر دعا سے امید خیر بھی ہے | یہ مدعا ہے تو انجام مدعا معلوم
یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی | وجود درد مسلّم علاج نا معلوم

نور و ظلمت جدا نہیں ہوتے	آپ کی چشم سرمہ سا کی قسم
میں ہوں فانیؔ صحیفۂ باقی	حرف بے معنیٔ فنا کی قسم

ردیف "ن"

وہ بے خبر شوق ہیں کچھ ان سے نہ کہنا	وہ دردِ محبت ترے ہم راز نہیں ہیں

ایک نہ ہی مختار ہیں ہم تو کہنے کو مجبور نہیں
ان کی رضا کے بندوں میں آزادی کا دستور نہیں

کس نے سنایا حال ہمارا آج جو یہ ارشاد ہوا
دردِ محبت والوں کو سنتے ہیں شفا منظور نہیں

غم کو ثبات بھی آخر کب تک اور یہ حیات بھی آخر کب تک
ہم بھی نہ ہوں گے۔ غم بھی نہ ہوگا وہ دن بھی کچھ دور نہیں

جن میں تمہارا نور رہا تھا ان میں اندھیرا رہتا ہے
جب سے گئے ہو آنکھوں میں آنسو تو بہت ہیں نور نہیں

یہ تو بُرے آثار ہیں فانیؔ۔ غم ہو خوشی ہو کچھ تو ہو
دل کا یہ کیا حال ہوا مغموم نہیں مسرور نہیں

زخم نصیب تھا جگر، زخم جگر سے کیا کہیں	ان کی نظر نے کیا کیا انکی نظر سے کیا کہیں
رسم وفا سے بے خبر ہم بھی نہیں مگر حضور	بس بھی تو آنسوؤں پہ ہو دیدۂ تر سے کیا کہیں
آہ انھیں کی ہے عطا۔ خیر وہ بے اثر سہی	وہیں گئے اثر بھی اب وہی یا با اثر سے کیا کہیں
رازِ دنیاز ہے کہیں منہ سے نکالنے کی بات	سجدۂ دل کی واردات سجدۂ سر سے کیا کہیں

شکوۂ غم سے فائدہ، شکرِ ستم بھی کیا ضرور — حسن کے شعبدوں کا حال شعبدہ گر سے کیا کہیں
دل کے سوا یہاں کوئی محرمِ رازِ دل نہیں — بے خبروں سے کیوں کہیں، اہلِ خبر سے کیا کہیں
حسن جفا پسند سے، حسرتِ عرضِ شوق کیا — تشنہ لبی کا ماجرا، آبِ گہر سے کیا کہیں
دل کے چمن کی ہر کلی دیر ہوئی کہ جل گئی — بادِ سحر کو کیا خبر، بادِ سحر سے کیا کہیں
فانی اب ان سے عرضِ حال کیجیے بار بار کیا — وہ نئے سر سے کیا سنیں، ہم نئے سر سے کیا کہیں

کشتیٔ اعتبار توڑ کے دیکھ — کہ خدا بھی ہے ناخدا ہی نہیں
میری ہستی گواہ ہے کہ مجھے — تو کسی وقت بھولتا ہی نہیں

ناخوش گوار ہے جو محبت کا تذکرہ — اچھا تو لاؤ اور کوئی گفتگو کریں
فرقت میں موت مانگنے والوں کا کیا قصور — آخر یہ نامراد کوئی آرزو کریں
مطلب یہ ہے کہ آج ہوئی نذرِ دل قبول — ارشاد ہے کہ آئینہ ہم روبرو کریں

کیے جائیں گے دل کے خاتمے پر شکر کے سجدے
دعاؤں نے کیا ہے خونِ حسرت سے وضو برسوں
جیے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں
مری اک عمرِ فانی نزع کے عالم میں گزری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

آ ورنہ جانتا ہوں فریبِ نظر کو میں — دیکھوں الٹ کے پردۂ داغِ جگر کو میں

ہر نقش پا کو دیکھ کے دھنتا ہوں سر کو میں
پہچانتا نہیں ہوں تری رہ گزر کو میں

گم کردہ راہ ہوں قدم اولیں کے بعد
پھر راہ بر مجھے نہ ملا، راہ بر کو میں

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو
پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

بہلا نہ دل، نہ تیرگیٔ شام غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

دو تین ہچکیوں میں دم نزع کہہ گیا
شرح دراز زندگیٔ مختصر کو میں

فانی دعائے مرگ کی فرصت نہیں مجھے
یعنی ابھی تو ڈھونڈھ رہا ہوں اثر کو میں

دل رہے آلودہ دامن اور ہم دیکھا کریں
آج اے اشکِ ندامت آ تجھے دریا کریں

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسمِ گل آگیا، زنداں میں بیٹھے کیا کریں

جا بجا تغیر حال دل کے چرچے ہیں تو ہوں
ہم ہوئے رسوا مگر اب ہم کسے رسوا کریں

مرگ بے ہنگام فانی وجہ تسکیں ہو چکی
زندگی سے آپ گھبراتے ہیں گھبرایا کریں

فصل خبر بڑھا گئی عمر کے باب راز میں
یاد وصال مختصر مل کے شب دراز میں

ہم نہ ازل سے آج تک سجدے سے سر اٹھا سکے
چھپ رہے جلوہ ہائے دوست کب کے حریمِ ناز میں

حشر میں حشر چاہیئے۔ حشر پہ حشر چاہیئے
دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیۂ نیاز میں

زہر ہے یاد وائے دل وہ ہیں کہ موت ہے قریب
رعشہ مری نظر میں ہے یا کفِ چارہ ساز میں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

آسماں بھی ترے کوچے کی زمیں ہے لیکن
وہ زمیں جس پہ ترا سایۂ دیوار نہیں

ہے عکس روئے دوست بہ اک پرتوِ مجاز
میری نظر بھی کھنچ گئی تصویر یار میں

دعویٰ یہ ہے کہ دوریِ معشوق ہے محال
مطلب یہ ہے کہ قرب نہیں اختیار میں

قربانِ اک ادائے تغافل پہ لاکھ بار
وہ زندگی جو صرف ہوئی انتظار میں

جتنے منہ ہیں اتنی باتیں دل کا پتہ کیا خاک چلے
جس نے دل کی چوری کی ہے ایک اسی کا نام نہیں

رک رک کے جو سانسیں آئیں گئیں مانا کہ وہ آہیں تھیں لیکن
آپ نے تیور کیوں بدلے آہوں میں کسی کا نام نہیں

جلوہ و دل میں فرق نہیں جلوے ہی کو اب دل کہتے ہیں
یعنی عشق کی ہستی کا آغاز تو ہے انجام نہیں

کب سے پڑی ہیں دل میں تیرے ذکر کی سارہی راہیں بند
برسیں گذریں اس بستی میں رسم سلام نہ پیام نہیں

دل سے کسی کی آنکھوں تک کچھ راز کی باتیں پہونچی ہیں
آنکھ سے دل تک آیا ہو ایسا تو کوئی پیغام نہیں

نزع میں فانی تو نے یہ کس کا چپکے چپکے نام لیا
کیوں او کافر تیری زباں پر اب بھی خدا کا نام نہیں

دل نہ تفتِ تپش ہے ہائے مگر نہ جہ تپش دل کہ ئی نہیں
بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں

کس زعم میں ہو اے رہروِ غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے اس راہ میں منزل کوئی نہیں

یہ واہمہ تھا یا مشکل تھی کیوں میں نے کہا کیا نادم ہوں
وہ پوچھتے ہیں کیا مشکل ہے کیا کہیئے کہ مشکل کوئی نہیں

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل ہے یوں نام کو ساحل کوئی نہیں

گو جلوۂ غیب شہود ہی پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں
نظارہ نظر میں شامل ہے نظارہ میں شامل کوئی نہیں

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرق مجاز و حقیقت کیا
یہ عرض حقیقت ہے وہ حقیقت ہستیٔ باطل کوئی نہیں

فانی ہی وہ اک دیوانہ تھا جو موت سے پہلے مرجائے
کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

رہ جائے کیوں فنا کا ہنگامہ نا مکمل ۔۔۔ کچھ میری زندگی سے لے لیجئے بلائیں
ہاں اے یقین وعدہ دامن ترا نہ چھوٹے ۔۔۔ یہ آسرا نہ ٹوٹے وہ آئیں یا نہ آئیں

جس طرف دیکھ لیا پھونک دیا طور مجاز ۔۔۔ یہ ترے دیکھنے والے وہ نظر رکھتے ہیں
خود تغافل نے دیا مژدۂ بے دادی مجھے ۔۔۔ اللہ اللہ مرے نالے بھی اثر رکھتے ہیں
بے بسی دیکھ یہ سو بار کیا عہد کہ اب ۔۔۔ تجھ سے امید نہ رکھیں گے مگر رکھتے ہیں

میری نظروں میں تو بے واسطۂ دید ہے تو ۔۔۔ ہیں بہ عنوان تجلی بھی تجھے یاد نہیں
آشیاں پر کرم برق کی باری آئی ۔۔۔ مژدہ اے ذوق بلا باغ میں صیاد نہیں

جور کو جور بھی اب کیا کہیے ۔۔۔ خود وہ تڑپا کے تڑپ جاتے ہیں
دل سے فانی یہ الجھ پڑنا کیا ۔۔۔ آپ دیوانے کے منھ آتے ہیں

سمجھو تو غنیمت ہے مرا گریۂ خونیں ۔۔۔ یہ رنگ ہو پھولوں میں نہ یہ بات خزاں میں
جھک جاتے ہیں سجدے میں اور پھر نہیں اٹھتے ۔۔۔ کیا سحر ہو کافر ترے نقش کف پا میں

سنتے تھے محبت آساں ہے واللہ بہت آساں ہے مگر
اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل سی مشکل میں نہیں

جب ڈوبنے والے ڈوب چکے اور ساحل و دریا ایک ہوئے
پھر لطف امید کہ ہم کہاں دریا میں نہیں ساحل میں نہیں

ان سے آگے جب یہ آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں — وہ حیا پرور نگاہیں مسکرا کر رہ گئیں

گھر جلاتے تو ہو مگر کس کا — دل ہے بندہ نواز طور نہیں
تم پہ مرنا جنھیں نہیں آتا — زندگی کا انھیں شعور نہیں
ہم بھی اپنی وفا پہ ہیں مغرور — بات کی بات ہو غرور نہیں
ہم نہ تھے کل کی بات ہو فانی — ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

ماورائے حد ہر منزل ہے شاید کوئے دوست
ہم نے جو چھانی نہ ہو ایسی کوئی منزل نہیں
کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جیئے جانے سے کچھ حاصل نہیں

نامہربانیوں کا گلہ تم سے کیا کریں — ہم بھی کچھ اپنے حال پہ اب مہرباں نہیں
ساری ہے والدہ دل مری رگ رگ میں چارہ ساز — کیا پوچھتا ہو درد کہاں ہو کہاں نہیں
تیرا کرم کہ تو نے وہ دل کو عطا کیا — جو غم بقدر حوصلۂ آسماں نہیں
بجلی کہیں گری ہو مگر ہم قفس مجھے — ڈر ہو کہ اب کسی نے کہا آشیاں نہیں

گردش میں تھا وہ ایک ہی جلوہ کہاں کہاں
تھی فرش راہ چشم تماشا کہاں کہاں
بزم الست، دار فنا- جلوہ گاہ حشر
پہونچی ہے لے کے ان کی تمنا کہاں کہاں

ذرّے میں دشت، قطرے میں طوفاں چھپے رہے
ڈالا مری نگاہ نے پردا کہاں کہاں

قلب و جگر کے درد کا پھر کس کو ہوش تھا
جب اس نے مسکرا کے یہ پوچھا کہاں کہاں

آخر نگاہِ دوست میں فانیؔ نے پا لیا
یوں مرگِ ناگہاں تجھے ڈھونڈا کہاں کہاں

جب کی ہے فکر تجزیۂ ہر مثال میں
گم ہو گئی ہے ان کی تجلّی جمال میں

امکانِ معرفت کو سمو کر محال میں
وہ دل میں یوں رہے کہ نہ آئے خیال میں

ملتی نہیں تصوّرِ ہستی سے اب نجات
گھر سا گیا ہوں حلقۂ دامِ خیال میں

آخر زمانہ آئینہ دکھلا کے رہ گیا
لانا پڑا تمھیں کو تمھاری مثال میں

اہلِ دنیا مجھے سمجھ لیں گے
دل کسی دن ذرا لہو تو کریں

قسمت ہوئی تھیں روزِ ازل جتنی شوخیاں
سب جمع ہو گئیں نگہِ شرمسار میں

سازِ ہستی کو بھی اب تم کے اشارے سے تو چھیڑ
اس میں ٹوٹے ہوئے دل کی نہ ہو آواز کہیں

مر کر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں
ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

ہاں دردِ عشق ان پہ کرم کی نظر رہے
صبر و قرار تیرے حوالے ہوئے تو ہیں

فانیؔ ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

اپنی تو ساری عمر ہی فانیؔ گذار دی
اک مرگ ناگہاں کے غمِ انتظار میں

ردیف "د"

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

بہارِ زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھو گے
کسی کا عیشِ مرگِ ناگہانی دیکھتے جاؤ

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اٹھا شورِ ماتم آخری دیدار میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانیؔ دیکھتے جاؤ

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کو
گریباں نے گلے لپٹا لیا ہے بڑھ کے داماں کو

مرے تلوؤں سے کانٹوں پر بھی گلکاریاں ہوں گی
مری وحشت مبارک ہو جنونِ عیش ساماں کو

بیاباں کو یہاں لے آئے تھے کچھ خاک کے ذرے
یہی ذرے اڑا لے جائیں گے اک دن بیاباں کو

نہ آیا موسمِ گل جب دلِ دیوانہ جیتا تھا
جواب آئے تو یارب آگ لگ جائے گلستاں کو

چھٹے جب قیدِ ہستی سے تو آئے کنجِ ہستی میں
رہا ہوتے ہیں یعنی ہم بدل دیتے ہیں زنداں کو

خدا رکھے محبت کو نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
اجل کہتے ہیں جس کو وہ ہماری زندگی کیوں ہے

بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار
سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو
نہ پوچھئے کہ محبت میں مجھ پہ کیا گذری
نہ چھیڑئیے مرے بھولے ہوئے فسانے کو
یہ شعبدے، یہ کرشمے کسے میسر تھے
تری نگاہ نے سکھلا دئے زمانے کو
چمن میں برق نے جھانکا کہ ہم لرز اٹھے
اب اس سے آگ ہی لگ جائے آشیانے کو
خیال یار بھی کھویا ہوا سا رہتا ہے
اب ان کی یاد بھی آتی ہے بھول جانے کو
زمانہ برسر آزار تھا مگر فانی
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

گویا نہیں تغافل و تمکیں میں کوئی فرق
اتنی بھی آدمی کو امید کرم نہ ہو
غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی
کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو
منظور ہر نوشتۂ تقدیر ہے مجھے
لیکن وہ جس میں حرف تمنا رقم نہ ہو

اے بے خودی ٹھہر کہ بہت دن گذر گئے
مجھ کو خیال یار کہیں ڈھونڈھتا نہ ہو
اچھا حجاب ہے کہ جب آتے ہیں خواب میں
پھر پھر کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

ردیف "ہ"

غربت میں سنگ راہ کچھ آسانیاں بھی تھیں
کھاتی ہیں ٹھوکریں مری مشکل جگہ جگہ

ہر کلمۂ الحق میں اک کیف انا بھر دوں
توبہ سے جو ٹکرا دوں اُلٹا ہوا پیمانہ
کچھ تذکرۂ جنت، کچھ تذکرۂ کوثر
کیا یوں بھی نہیں جائز ذکر مئے و میخانہ

حیرت نے مجھے تیرا آئینہ بنایا ہے — اب تو مجھے دیکھا کر اے جلوۂ جانانہ

حسن تدبیر نہ رسوا ہو جائے — رازِ تقدیر الٰہی کو نہ پوچھ
زندگی جادۂ بے منزل ہے — مسلکِ رہبر و راہی کو نہ پوچھ
غلط انداز نگاہوں کو سنبھال — میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ

دل کی طرف حجابِ تکلف اٹھا کے دیکھ — آئینہ دیکھ اور ذرا مسکرا کے دیکھ
ہر زندگی کا نام نہ رکھ دل کی زندگی — ایمان زندگی پہ نہ لا آزما کے دیکھ
تیری تجلیوں سے کسی طرح کم نہیں — دل کی تجلیوں کو بھی دل میں لا کے دیکھ
اب کی ادائے خاص سے کر امتحان دل — جو برق طور پر نہ گری ہو گرا کے دیکھ
فانی سفینہ اب بھی نہ ڈوبے تو کیا کرے — طوفان کو نہ دیکھ ستم ناخدا کے دیکھ

ردیف "ی"

کہتے ہیں ذرا پھر سے افسانۂ غم کہئے — اس حسن تجاہل کو کس طرح کرم کہئے
تھوڑی بھی بہت ہو گی فرصت ہی میں سن لینا — یہ دل کی کہانی ہے کیا کہئے جو کم کہئے

دکھا نہ اہل دل نے کسی دن اٹھا کے آنکھ — دنیا گذر گئی غم دنیا لئے ہوئے
اٹھنا وہ تیرے در سے کسی نامراد کا — اک آہ زیر لب کا سہارا لئے ہوئے

ہم موت بھی آئے تو مسرور نہیں ہوتے — مجبورِ غم اتنے بھی مجبور نہیں ہوتے
اربابِ محبت پر تم ظلم کے بانی ہو — یہ ورنہ محبت کے دستور نہیں ہوتے
کونین یہ بھاری ہے اللہ رے غرور ان کا — اتنے بھی ادا والے مغرور نہیں ہوتے

تم کیا جانو کیا شے ہے طوفان سرشک خونیں کا
تم نے چھلکتے کبھی نہیں دیکھی دل کی گلابی کیا کہئے

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حشر انھیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرز تبسّم۔ یہ شادابی کیا کہئے

کتنے فتنے جمع کئے ہیں ان کی ایک جوانی نے
چال قیامت، کافر نظریں۔ آنکھ شرابی کیا کہئے

قصّہ زیست مختصر کرتے
کچھ تو اپنی سی چارہ گر کرتے

موت کی نیند سو گئے بیمار
روز کس شام کو سحر کرتے

سچ ہے ہر نالہ کیوں رسا ہوتا
میرے نالے تجھے کیوں اثر کرتے

کرلیا تیرے نام پر سجدہ
اب کہاں قصد سنگ در کرتے

کاش آئینہ ہاتھ سے رکھ کر
تم مرے حال پر نظر کرتے

دل کی جو حقیقت ہے کیا کہئے حسن بھی دل ہے عشق بھی دل
ہر شمع جلائی جاتی ہے پردے میں کسی پروانے کے

عہد جوانی اور پھر دل میں ان کی محبت کیا کہئے
دیوانے کا خواب اور وہ بھی خواب قیامت کیا کہئے

کچھ بس ہی نہ تھا ورنہ یہ الزام نہ لیتے
ہم تجھ سے چھپا کر بھی ترا نام نہ لیتے

کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی
اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

اللہ رے سکونِ قلب اس کا دل جس نے لاکھوں توڑ دیئے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

دل کی یہ ویرانی ہی عجب ہے وہ بھی آخر کیا کرتے
جب دل میں ان کے رہتے بستے یہ ویرانی کم نہ ہوئی

احباب سے کیا کہیئے اتنا نہ ہوا فانیؔ
جب ذکر مرا آتا مرنے کی دُعا کرتے

جب پرسشِ حال وہ فرماتے ہیں جانیئے کیا ہو جاتا ہے
کچھ یوں بھی زباں نہیں کھُلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے

اب خیر سے ان کی بزم کا اتنا رنگ تو بدلا میرے بعد
جب نام مرا آجاتا ہے کچھ ذکر وفا ہو جاتا ہے

یکتائے زمانہ ہونے پر صاحب یہ غرورِ خدائی کا
سب کچھ ہو مگر ظالم بد ہن کیا کوئی خدا ہو جاتا ہے

قطرہ قطرہ رہتا ہے دریا سے جدا رہ سکنے تک
جو تابِ جدائی لا نہ سکے وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

پھر دل سے تمنائی سارے کے سارے نقش خفا مٹ جاتے ہیں
جس وقت وہ ظالم سامنے آکر جانِ حیا ہو جاتا ہے

تم سے بھی ہو آگاہ پھر اپنی بھی خبر ہو | دیوانہ تمھارا کوئی دیوانہ نہیں
جل جانے گے انداز کوئی شمع سے سیکھے | پروانہ ہے اور کہنے کو پروانہ نہیں

ان کی آواز آ رہی تھی دل کے پاس
دیر تک کچھ گفتگو کرتے رہے
روز بڑھتی ہی رہی اک آرزو
روز ترک آرزو کرتے رہے

دل کو نہ کیوں کہوں جو ازل سے خراب ہے
یہ کیوں کہوں کہ ان کی تمنا عذاب ہے
جب تو یہ تھا کہ ہے وہ تجلی حجاب میں
اب کچھ نہیں تو ان کی تجلی حجاب ہے

خلشیں تھیں ہمارے دم کے ساتھ
آج کانٹے نکل گئے دل کے
پھول کو بھول جانے والے
کل یہ چھینٹے تھے خون بسمل کے
تیز تر جادۂ فنا سے گذر
مٹ رہے ہیں نشان منزل کے
ان کی نظریں ہی کچھ کہیں تو کہیں
ان کی نظروں نے کیا کیا مل کے
رگ فانی میں اب تو دیر نہ کر
سہل فرمانے والے مشکل کے

تمہارا درد تو درماں بنا گیا ہم نے
اب اور سوچئے تدبیر دل دکھانے کی
پلٹ پلٹ کے قفس ہی کی سمت جاتا ہوں
کسی نے راہ بتائی نہ آشیانے کی

مشتاق خبردار رہیں دل سے، جگر سے
ملتی ہی زمانے کی نظر ان کی نظر سے
دل جن سے ملے اب وہ نگاہیں نہیں ملتیں
ملنے کو تو ملتی ہے نظر ان کی نظر سے
پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں جو کبھی ارماں نکلے
سینہ میں دھواں خیر ہو اٹھتا ہے کدھر سے
کیا پھر ترے ناوک نے کیا عزم نوازش
لبیک کی آتی ہے صدا چاک جگر سے
کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی
روتی ہے گلے مل کے سحر شمع سحر سے

چمکا دیا ہے رنگِ چمن لالہ زار نے — شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے
تربت سے پھول شام سے مرجھا کے رہ گئے — رو رو کے صبح کی مری شمعِ مزار نے
ہاں ہم نہ تھے فریبِ تمنا سے بے خبر — کیا کہیے کیا کیا دلِ امیدوار نے

آزردہ کیوں ہوئے مری آشفتگی سے تم — آخر یہی تو زلف شکن در شکن میں تھی
اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے — میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی
کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں — کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی
بدلا ہوا تھا رنگ، گلوں کا ترے بغیر — کچھ خاک سی اڑی ہوئی سارے چمن میں تھی
لو آج مرگِ فانیؔ بے کس سے مٹ گئی — وہ اک خلش جو خاطرِ اہلِ وطن میں تھی

ہم اپنے جی سے گذرے یوں سحر کی — شبِ غم بڑھ چلی تھی مختصر کی
تمھیں کس دل سے اپنا جان کہیے — وفا اس نے تو کی اور عمر بھر کی
مرا قتل ان کے ہاتھوں یہ تو باتیں — کچھ ان کے منہ کی ہیں کچھ نامہ بر کی
اٹھا ہاتھ اے تصور فاتحہ کو — یہ دل کی ہے وہ تربت ہے جگر کی

کم ہے یا بڑھ گئی وحشت ترے دیوانوں کی — دامنوں کی ہے خبر اب نہ گریبانوں کی
فصلِ گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی — دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی
طوقِ منت کے بڑھا۔ ہو گئی منت پوری — بیڑیاں موت نے لے کاٹیں ترے دیوانوں کی
دل کے تیور تو بجھے یاس کے چھینٹوں سے مگر — نہ بجھی آگ لگائی ہوئی ارمانوں کی
چشمِ ساقی کی وہ مخمور نگاہیں توبہ — آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
اب جا ہے نہ وفا یادِ وفا باقی ہے — تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانوں کی

آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

میں منزلِ فنا کا نشانِ شکستہ ہوں
تصویرِ گرد بادِ فنا ہوں مٹی ہوئی

مرحوم کس ادا کے تماشائیوں میں تھا
پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی

کیجیے دعا کہ اف تو کرے دردمندِ عشق
اوّل تو دل کی چوٹ پھر اتنی دکھی ہوئی

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آ رہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

متاعِ جلوہ تحیّر ہے۔ مجھ کو تکتا ہے
دل آئینہ ہے کہ منہ آئینہ کا تکتا ہے

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

یقیں میں عکسِ موجوداتِ عالم ہم نے دیکھا ہے
وہ دریا ہے یہ قطرہ لیکن اس قطرہ میں دریا ہے

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارہ ہے بہہ جائے تو دریا ہے

تمہارے ظلم۔ طعنے غیر کے، لوگوں کے آوازے
محبّت میں دلِ مجبور کو سب کچھ گوارا ہے

محبت ہی نہیں تو پاسِ آدابِ محبت کیا
وفا کی یا جفا کی جانے دو یہ ذکر ہی کیا ہے

یہ کیا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہے

یاس کے آتے ہی ارماں دل سے یہ کہکر چلے
ہم نشیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے

دیکھیے کیا ہو وہ اور آزردگیٔ بے سبب
ہم خطا ناکردہ خوگر عذرِ بے تقصیر کے

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میّت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی
مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

آتے ہی تیرے وعدۂ فردا کا اعتبار
گھبرا کے مر نہ جائے تو پھر کیا کرے کوئی

کہتے ہیں حسن کی ہی امانت ہے دردِ عشق
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

وہ جلوہ بے حجاب سہی ضد کا کیا علاج
جب دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی

خالی ہے بزم ذوقِ طلب اہلِ ہوش سے
اتنا نہیں کہ تیری تمنا کرے کوئی

وہ درد دے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو
اس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

فانی دعائے مرگ کی تکرار کیا ضرور
غافل نہیں کہ ان سے تقاضا کرے کوئی

کیوں کر میں کہوں تم نے آئینہ نہیں دیکھا
بے وجہ نہیں ہرگز آئینہ کی حیرانی

یاں میرے قدم سے ہے ویرانے کی آبادی
واں گھر میں خدا رکھے آباد ہے ویرانی

فانی وہ بلاکش ہوں غم بھی مجھے راحت ہے
میں نے غمِ راحت کی صورت بھی نہ پہچانی

یوں مٹ گئی دعا کہ زمانے کا ذکر کیا
اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

اب لب پہ وہ ہنگامۂ فریاد نہیں ہے
اللہ رے تری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے

آتی ہے صبا سوئے لحد ان کی گلی سے
شاید مری مٹی ابھی برباد نہیں ہے

اللہ بچائے اثرِ ضبط سے ان کو
بے داد تو ہے شکوۂ بیداد نہیں ہے

آمادۂ فریاد رسی ہے وہ ستم گر
فریاد کہ اب طاقتِ فریاد نہیں ہے

دنیا میں دیارِ دلِ فانی کے سوا ہائے
کوئی بھی وہ بستی ہے جو آباد نہیں ہے

صدقے اتریں گے اسیرانِ قفس چھوٹے ہیں
بجلیاں لے کے نشیمن پہ گھٹا بھی آئی

ہاں نہ تھا بابِ اثر بند مگر کیا کہیے
آہ پہونچی تھی کہ دشمن کی دعا بھی آئی

لو مسیحا نے بھی اللہ نے بھی یاد کیا　　آج بیمار کو ہچکی بھی قضا بھی آئی

افشائے رازِ اہلِ جنوں مصلحت نہیں　　پھرتا ہوں دھجیوں کو گریباں کئے ہوئے
کیوں اہلِ حشر ہو کوئی نقادِ سوزِ دل　　لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

دنیا مری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے
آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے
خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کیا ہستی ہے
عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے رازِ بلندی پستی ہے
جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے
وحشتِ دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے
جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے
آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

محشر میں عذرِ قتل بھی ہے خوں بہا بھی ہے
وہ اک نگاہ جس میں گلہ بھی حیا بھی ہے

اس درد کا علاج اجل کے سوا بھی ہے
کیوں چارہ ساز تجھ کو امیدِ شفا بھی ہے

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

ہاں دل میں درد بھی ہے زباں بھی نہیں ہے بند
کس سے کہیں کوئی دلِ درد آشنا بھی ہے

سامانِ صد نگاہ ہے ہر ذرہ خاک کا
لیکن یہ دیکھنا ہے کوئی دیکھتا بھی ہے

فانی کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی
لے خوابِ محبت کی تعبیر نظر آئی

ہر عیش کی محفل میں پروانہ کا ماتم تھا
جو شمع نظر آئی دلگیر نظر آئی

کعبہ میں کلیسا میں ہم نے تو جہاں دیکھا
اے قصرِ وفا تیری تعمیر نظر آئی

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

دل ان کے نہ آنے تک لبریزِ شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

فانی غمِ ہستی نے زندہ ہی مجھے سمجھا
جب تک مرے مرنے میں تاخیر نظر آئی

کی وفا یار سے ایک ایک جفا کے بدلے
ہم نے گن گن کے لئے خون وفا کے بدلے

کی سپردِ درِ بت خانہ اجل نے مری خاک
کس کو سونپا مجھے ظالم نے خدا کے بدلے

کفن اے گردِ لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے
آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے

عشق اللہ بچائے وہ مرض ہے فانی — زہر بیمار کو دیتے ہیں دوا کے بدلے

ترک غم ساحل کا حاصل نظر آتا ہو — لے ڈوبنے والے وہ ساحل نظر آتا ہے
دل کھوئے ہوئے برسوں گذرے ہیں مگر اب بھی — آنسو نکل آتے ہیں جب دل نظر آتا ہے
آغاز محبت میں جینے ہی کے لالے تھے — اب خیر سے مرنا بھی مشکل نظر آتا ہے
تو مست خود آرائی، ہم حسن کے متوالے — جو ہے تری محفل میں غافل نظر آتا ہے
موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی — گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

اب انھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے — چشم بد دور دلھن بن کے شباب آتا ہے
ہجر میں بھی مجھے امداد اجل تھی درکار — میری تربت پہ نہ آ تجھ سے حجاب آتا ہے
دید آخر ہے الٹ دیجئے چہرے سے نقاب — آج مشتاق کے چہرے پہ نقاب آتا ہے
کس طرف جوش کرم تیری نگاہیں اٹھیں — کون محشر میں سزاوار عتاب آتا ہے
موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم — کیا جنازہ پہ وہ غارت گر خواب آتا ہے
دل کو اس طرح ٹھہر جانے کی عادت تو نہ تھی — کیوں اجل کیا مرے نامے کا جواب آتا ہے

جس قدر چاہے وہ جلوؤں کو فراوانی دے — ہاں نظر دے تو مجھے فرصت حیرانی دے
وحشت تازہ کو فور رز مبارک اے عشق — پھر بہار آئی مجھے خلعت عریانی نہ دے
اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یارب — در و دیوار دئے اب انھیں ویرانی دے

ابھری ہوئی ہے چوٹ دل دردمند کی — رکھنا قدم تصور جاناں سنبھال کے
کہتے ہیں جن کو عرف محبت میں داغ دل — وہ نقش تو نہ ہوں ترے پائے خیال کے

سمائیں آنکھ میں کیا شعبدے قیامت کے / مری نظر میں ہیں جلوے کسی کی قامت کے
یہاں بلائے شبِ غم، وہاں بہارِ شباب / کسی کی رات کسی کے ہیں دن قیامت کے
ستارے ہوں تو ستارے نہ ہوں تو برق بلا / چراغ ہیں تو یہ ہیں بیکسوں کی تربت کے

مانا کہ بعد وعدۂ فردا یہ ٹل گئی / اور بے وفا جو کل بھی نہ یہ، آج کل گئی
تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب / اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی
اس خانۂ خراب کی بربادیاں نہ پوچھ / یادش بخیر آہ بھی دل سے نکل گئی
کچھ کہہ کے چارہ ساز نے تسکین دی تو ہے / سنتا تو ہوں کہ ایک ہی حالت سنبھل گئی
تعمیر آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق / جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی
فانی کے دل سے آیۂ لاتقنطوا کے بعد / زاہد وہ دل فریبیٔ حسنِ عمل گئی

قطرہ دریائے آشنائی ہے / کیا تری شانِ کبریائی ہے
تیری مرضی جو دیکھ پائی ہے / خلشِ درد بن کے آئی ہے
وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا / نارسائی سی نارسائی ہے
جلوۂ یار کا بھکاری ہوں / شش جہت کاسۂ گدائی ہے
بجھ گئے راہِ یار میں کانٹے / کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے
مژدۂ جنتِ وصال ہے موت / زندگی محشرِ جدائی ہے

امیدِ التفات کو رسوا نہ کیجئے / لازم نہیں کہ خونِ تمنا نہ کیجئے
سرکار پاسِ وضعِ جفا چاہتا ہوں میں / یہ بھی اگر وفا ہی تو اچھا نہ کیجئے
کیا فرض تھی نگاہِ بحرمِ ازل کے بعد / یہ جان ہے یہ دل ہے تقاضا نہ کیجئے

شرمندۂ وہم رنگ سے آشنا نہ کیجیے
آئینہ دیکھ کر مجھے دیکھا نہ کیجیے

لبریز تو یوں تھا اک اک خطِ پیمانہ
محفل سے جو وہ اُٹھے لیتے ہوئے انگڑائی
پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکر بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

ادا سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے
تمہیں کہو تمہیں اپنا سمجھ کے کیا پایا
مگر یہی کہ جو اپنے تھے سب پرائے ہوئے
سحر ہوئی کہ وہ یادش بخیر آتا ہے
چراغ ہیں مری تربت کے جھلملائے ہوئے

کارواں گذرا کیا ہم رہ گذر دیکھا کیے
ہر قدم پر نقشِ پائے راہ بر دیکھا کیے
دردمندانِ دنیا کی ہائے رے مجبوریاں
دردِ دل دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کیے
یاس جب چھائی امیدیں ہاتھ مل کر رہ گئیں
دل کی نبضیں چھٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کیے
رخ مری جانب نگاہِ لطف دشمن کی طرف
یوں ادھر دیکھا کیے گویا اُدھر دیکھا کیے
تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کیے

مجھے قسم ہے ترے صبر آزمانے کی
کہ دل کو اب نہیں برداشت غم اٹھانے کی
ترا اسیر ہوں چاہے تو ذبح کر صیاد
نہ توڑ دل یہ امانت ہے آشیانے کی
خیال یار ہے اک حسن و عشق کی دُنیا
مری نگاہ میں ہیں گردشیں زمانے کی
گلہ ضرور نہیں، حالِ بےخودی معلوم
تمھاری یاد کو عادت ہے بھول جانے کی
زبانِ حال ٹھہر، داستانِ عشق نہ چھیڑ
کہ خوابِ مرگ ہے تاثیر اس فسانے کی
نہ دل کے ظرف کو دیکھو، نہ طور کو دیکھو
بلا کی دھن ہے تمھیں بجلیاں گرانے کی

نہ سانس کا ہے بھروسہ نہ آہ میں تاثیر — وہ کیا پھرے کہ ہوا پھر گئی زمانے کی
نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے رے — ادا وہ یاد ہی گھبرا کے روٹھ جانے کی
جبینِ درد ہے بے تاب سجدہ اے فانی — کدھر ہے خاک ترے دل کے آستانے کی

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل — غریب کشمکشِ جبر و اختیار میں ہے
چمن سے رخصتِ فانی قریب ہے شاید — کچھ اب کے بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

یا میرے بے شمار گناہوں سے درگذر — یا میرے عذر سن کہ کرم بے حساب ہے

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے
کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبور خاموشی کا ہائے — وہ جنازے پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے
کیا تمھیں اندازۂ ضبطِ محبت ہو گیا — چشم بد دور اب ستم حد سے سوا کیوں ہو گئے

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے — یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے
تری خدائی میں ہوتی ہے ہر سحر کی شام — الٰہی اپنی سحر کی بھی شام ہو جائے

وہ مری شکایت پر جب کھڑے ہیں محشر میں — بت انھیں بنا پایا اب خدا خدا کر کے
لذتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی — دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے

اس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے ہم — بلبلا ہے عین دریا پھر بھی دامن چیدہ ہے

دیکھ فانی وہ کوئی حشر اُٹھاتا آیا | چونک اب خواب لحد سے کہ سحر ہوتی ہے

اللہ اللہ سرخیٔ رنگ شفق ہجوں لے جنوں | آسماں کیا کوئے قاتل کی زمیں ہونے کو ہے

اے داغ دل اے کھوئے ہوئے دل کی نشانی | آ فانیٔ بے دل تجھے سینے سے لگا لے

گو ہستی تھی خواب پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی | چونک اُٹھتے تھے ہم گھبرا کے پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

روداد مرگ و زیست یہ ہے قصہ مختصر | مجبور زندگی کو بھی جینا محال ہے

اے تری شان کہ بت خانہ سے کعبہ بن جائے | دل کہ مسکن ہے ترا کعبہ سے بت خانہ بنے
لب تک آجائے غم ہجر تو شکوہ ہو جائے | آپ سُن لیں تو عجب کیا ہو کہ افسانہ بنے

یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اس نے کہا کہیے | تو چپ ہیں کہ کیا کہیے کھلتی ہے زباں کوئی

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے | میں جو رویا مسکرا کے رہ گئے
یا ترے محتاج ہیں اے خون دل | یا الٰہی آنکھوں سے دریا بہہ گئے
موت ان کا منہ ہی تکتی رہ گئی | جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے
پھر کسی کی یاد نے تڑپا دیا | پھر کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے
اٹھ گئے دنیا سے فانی اہل ذوق | ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

ہر دل ہے تیرے غم کی امانت لئے ہوئے
ذرّے ہیں اک جہانِ حقیقت لئے ہوئے

دے اذنِ عامِ عشق کہ تاراج ہوش کا
بیٹھا ہوں دل میں صبر کی دولت لئے ہوئے

محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی
دنیا ہی بدل دی ہے تعمیرِ نشیمن نے

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آ کے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

جب قفس میں موسمِ گل کا تصور بندھ گیا
ہر طرف اُجڑا ہوا اک آشیاں دکھا گئے

جلوہ ترا طلسمِ حجاباتِ نور ہے
جو جس قدر قریب ہے اتنا ہی دور ہے

تسلیم ہیں مجھے بھی تری بے نیازیاں
یہ کیا کہوں کہ میری تمنا غیور ہے

وہ دیکھ سامنے ہیں نشیب و فرازِ شوق
بڑھ اور دو قدم کہ یہ ایمن نہ طور ہے

گھٹتا ہی جا رہا ہے گریباں کا فاصلہ
پھر دستِ شوق دامنِ جاناں سے دور ہے

ہر ذرۂ نشاط سے محروم کر دیا
ارشاد ہے کہ ہجر میں جینا ضرور ہے

گریۂ جوشِ ندامت بس اب تھمنے کا تو نام نہ لے
جب تک رحمت کا ہر پہلو دل کا دامن تھام نہ لے

دل کی لامحدود فضا میں گم ہو جا، یوں آپ کو ڈھونڈھ
ہوش کے بس کا روگ نہیں ہے ہوش سے تو یہ کام نہ لے

رات کا مفہوم یہی ہے جہدِ طلب سے باز نہ آ
بڑھتے دے دل کی بے چینی تڑپے جا آرام نہ لے

کافر صورت دیکھ کے منہ سے آہ نکل ہی جاتی ہے
کہتے کیا ہو اب کوئی اللہ کا یوں بھی نام نہ لے

آدابِ طلب سیکھ طلب بے ادبی سے — مجرم ہے وہ سائل جو درِ دل پہ صدا دے

کیفیت ظہورِ فنا کے سوا نہیں — ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے
اب زندگی ہے نام اسی امید دور کا — ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا کہیں جسے
کیا قہر ہے لطافتِ دل پر گراں نہیں — وہ پیرہن غبار تمنا کہیں جسے
ہے اتصالِ قطرہ و دریا پہ منحصر — وہ آبروئے قطرہ کہ دریا کہیں جسے
کب تک رہین ذوق تماشا رہے کوئی — اب وہ نگاہ دے کہ تماشا کہیں جسے
دریوزۂ فنا مرے مسلک میں ہے حرام — دریہ وہ زندگی کا تقاضا کہیں جسے

مژدۂ عیش بہ تمہید پریشانی ہے — للہ الحمد کہ پھر غم کی فراوانی ہے
قطرہ کیا موج کسے کہتے ہیں کیا گرداب — ڈوب کر دیکھ نہ دریا ہے نہ طغیانی ہے

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی — دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
محضر ہے یہی قتل شہیدانِ وفا کا — جھلانے کی چتون ہے جو شرمائی ہوئی سی
سنتا ہوں جو آتی ہے صدا پردۂ دل سے — امید کی آواز ہے تھرائی ہوئی سی
درپیش ہے پھر مسئلہ طاقتِ دیدار — پھر کچھ نگہ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی

اک عالمِ دل ہے یہی دنیا یہی فردوس
ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی

ہوں وہ فریب خوردۂ رہبر کہ لاکھ بار
پلٹا کے لے چلا ہے مرا نقشِ پا مجھے

سامنے آئیں جو ہوں دعوائے تقویٰ والے
چشمِ ساقی کی ادا مے کدہ بر دوش ہوئی

مجبوریِ عریاں کو یہ خلعتِ مختاری
اللہ رے کرم ہم اور توفیقِ گنہگاری

بے داد کا گلہ تو کروں اور جو وہ کہیں
"یہ کہئے امتحانِ وفا ناگوار ہے"
مختار ہوں کہ معترفِ جبرِ دوست ہوں
مجبور ہوں کہ یہ بھی کوئی اختیار ہے
آدابِ عاشقی کا تقاضا ہے اور بات
تو ورنہ دل کی آڑ میں خود بیقرار ہے

کچھ شرحِ بیخودی ہے کچھ ہوش کا فسانہ
یہ بے حسی جو شاید تمہیدِ زندگی ہے

یوں ملی ہر نگاہ سے وہ نگاہ
ایک کی ایک کو خبر نہ ہوئی
اللہ اللہ یہ حسنِ پرسشِ حال
کہ مرے حال پر نظر نہ ہوئی

فردوس بداماں ہے ہر نقشِ خیال ان کا
یہ شانِ تصور ہے تصویر کو کیا کہئے
وہ برق کی یورش ہے ہر شاخ میں لرزش ہے
ایسے میں نشیمن کی تعمیر کو کیا کہئے
یارب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی
لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہئے

جبیں صرفِ سجود بے جبیں معلوم ہوتی ہے — طبیعت بے نیازِ کفر و دیں معلوم ہوتی ہے
نگاہِ ناز سوزِ عشق دونوں ایک ہیں لیکن — کہیں ہوتی ہے یہ بجلی کہیں معلوم ہوتی ہے
نہیں معلوم راہِ شوق میں ہے بھی کوئی منزل — جہاں تھک کر نظر ٹھہرے وہیں معلوم ہوتی ہے
مری ہستی کہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے خدا رکھے — ترے پیمانِ باطل کا یقیں معلوم ہوتی ہے
زمینِ حشر فانی کیا قیامت ہے معاذ اللہ — مجھے اپنے وطن کی سی زمیں معلوم ہوتی ہے

پھیر لے میت کی جانب سے نگاہِ التفات — سینکڑوں شکووں کے نرغے میں لبِ خاموش ہے
رازِ آزادی فقط تیرے اسیروں پر کھلا — جو ترے قدموں پہ سر ہے بے نیازِ دوش ہے
زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیے مگر — موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

ہر جلوۂ محسوس کو مرہونِ نظر کر — اس بزم میں ہر شمع کو پروانہ بنا دے
آ اور دلِ برباد میں اک حشر بپا کر — جا اور دلِ آباد کو ویرانہ بنا دے
حیرت کدۂ ناز ہیں دل بھی ہے نظر بھی — اب دوست جسے آپ سے بیگانہ بنا دے
افسانۂ دل یوں کوئی سنتا نہیں فانی — اب موت کسی دن مجھے افسانہ بنا دے

گم ہیں رہِ تسلیم میں طالب بھی طلب بھی — سجدہ ہی درِ یار ہے سجدہ ہی جبیں ہے
کچھ مظہرِ باطن ہوں تو کچھ محرمِ ظاہر — میری ہی ہمادہ ہستی ہے کہ ہے اور نہیں ہے
ایذا کے سوا لذتِ ایذا بھی ملے گی — کیوں جلوہ گہِ ہوش یہاں دل بھی کہیں ہے

تو بھی کر دے غلطی ہائے محبت کو معاف — اک امیدِ وفا پر ہے پشیماں کوئی
برق نے میرے قفس کو بھی نشیمن سمجھا — آہ ایسا بھی نہ ہو سوختہ ساماں کوئی

موج کیا۔ گرداب کیسا۔ کیوں کسی کا نام لوں
خود سفینہ ہی مرا ، عوت ہو طوفاں کے لئے

پھر ہوا گورِ غریباں میں بگولوں کا ہجوم
خاک دِل اُٹھتی ہے تنظیمِ بیاباں کے لئے

دل کی یہ شوریدگی شبہائے غم اتنی دراز
اہتمام اتنے تری زلفِ پریشاں کے لئے

حکمِ وحشت ہے کہ زنداں کو بھی صحرا جانو
دل وہ آزاد کہ صحرا کو بھی زنداں سمجھے

آہ سے یا آہ کی تاثیر سے
جی بہل جاتا کسی تدبیر سے

جبر کو کیوں کر نہ سمجھوں اختیار
تم نے باندھا ہے مجھے زنجیر سے

دل سراپا نظر۔ وہ حسنِ تمام
ہند کر آنکھ دیکھتا کیا ہے

مدعا ہے کہ مدعا نہ کہوں
پوچھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے

ہائے وہ تیرے ذکر میں یہ بھی ہے آرزو کہ کاش
کوئی کہے کہ بزمِ ناز۔ تو جو نہیں اُداس ہے

چل تو رہے ہیں سب مگر۔ ہے کوئی منزل آشنا
مدعیانِ آرزو۔ دل بھی کسی کے پاس ہے

ترکِ خودی ہے ہوشِ عشق۔ درکِ خودی ہے جوشِ عشق
خود نشناس و خود شناس جو ہے خدا شناس ہے

دَیر میں یا حرم میں گذرے گی
عمر تیرے ہی غم میں گذرے گی

کچھ اُمیدِ کرم میں گذری عمر
کچھ اُمیدِ کرم میں گذرے گی

زندگی یادِ دوست ہے یعنی — زندگی ہے تو غم میں گذرے گی
اب کرم کا یہ ماحصل ہے کہ عمر — یادِ عہدِ ستم میں گذرے گی
دل کو شوقِ نشاطِ وصل نہ چھیڑ — غم میں گذری ہے غم میں گذرے گی
حشر کہتے ہیں جس کو اے فانی — وہ گھڑی شرحِ غم میں گذرے گی

تو شمعِ آئینہ خانہ ہے آئینہ کیا ہے — تری خدائی کے قربان ماسوا کیا ہے
اُٹھا بھی دے نگہِ ماسوا نگر کا حجاب — یہ دیکھنے ہی کا پردہ ہے دیکھتا کیا ہے
کیا ہے خلق مجھے باوجودِ علمِ گناہ — یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات — مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

تجھ سے انکار بن نہیں پڑتا — اپنی ہستی گواہ ہوتی ہے
طاقتِ ضبط کا سوال نہیں — اب تو ہر سانس آہ ہوتی ہے

لبیک کہا کس کو حیاتِ ابدی نے — دم توڑ دیا کیا ترے قدموں پہ کسی نے
مجموعۂ آدابِ دو عالم ہے محبت — مرنے کے سلیقے ہیں نہ جینے کے قرینے
مر کے ہی بن آتی ہے نہ جیتے ہی بن آئی — مارا مجھے قاتل کی مسیحا نفسی نے
پڑتا نہیں اس آئینہ میں عکس کوئی اور — دل میں تری تصویر سی رکھ دی ہے کسی نے
آئینہ بصد جلوہ وہ ہر جلوہ بصد رنگ — سمجھا گیا نہ کیا تیری تماشا طلبی نے
دو نام ہیں ہستی و فنا ایک ہی دل کے — مارا ہے اسی دل نے جلایا ہے اسی نے
امید بھی کیا شے ہے کہ ہر سانس میں فانی — کچھ زندگیِ خضر کے پاتا ہوں قرینے

آہ اب تک تو بے اثر نہ ہوئی ۔۔۔ کچھ تمھیں کو مری خبر نہ ہوئی
شام سے فکر صبح کیا سو شب ہجر ۔۔۔ مر رہیں گے اگر سحر نہ ہوئی
حشر کا دن بھی ڈھل گیا فانی ۔۔۔ دل کی روداد مختصر نہ ہوئی

اب برق نشیمن کو ہر شاخ سے کیا مطلب ۔۔۔ جس شاخ کو تاکا تھا وہ شاخ جلا ڈالی
جینے بھی نہیں دیتے مرنے بھی نہیں دیتے ۔۔۔ کیا تم نے محبت کی ہر رسم اٹھا ڈالی
جینے میں نہ اب فانی مرنے میں شمار اپنا ۔۔۔ ماتم کی بساط اس نے کیا کہہ کے اٹھا ڈالی

کس کو کہئے ماسوا جب تم نہیں تو کچھ نہیں ۔۔۔ تو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا مجھے
میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات ۔۔۔ جب مزاج دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

ادائیں آگئیں کچھ بے تباں کی ۔۔۔ زمیں تک ہے رسائی آسماں کی
زباں کٹتی ہے ذکر آشیاں پر ۔۔۔ تمنا بھی بہت تھی آشیاں کی
حرم میں آہی نکلے ہیں تو فانی ۔۔۔ یہ کیا کہئے کہ نیت تھی کہاں کی

وہ ہم سے کہاں چھپتے ہم خود ہیں حجاب ان کا ۔۔۔ محمل ہیں جو چھپتے ہیں، چھپتے نہیں محمل سے
ایمان محبت کی بجھتی نہیں چنگاری ۔۔۔ اٹھتا ہے دھواں اب تک خاک حرم دل سے
تجھ کو یہ خبر ہوگی ہم کو تو نہ تھی ناصح ۔۔۔ پہلے ہی نظر اٹھ کر لڑ جائے گی قاتل سے

گل جیب کے لئے اور نہ گلشن کے لئے ہے ۔۔۔ جو گل ہے ترے گوشۂ دامن کے لئے ہے
چل گور غریباں میں تو اس خاک سے بچ کر ۔۔۔ تیرے ہی جو سمٹے ہوئے دامن کے لئے ہے

مدفن جو سرِ رہ گذرِ دوست ہے فانیؔ ‏ روز ایک قیامت مرے مدفون کے لئے ہے

مجھے موت کا آسرا دے رہے ہیں ‏ مری زیست کا مدعا ہونے والے
کوئی بے نیازی کی حد بندہ پرور ‏ کسی کے ہو شاید خدا ہونے والے

کیوں رہے ہیچ میں یہ واسطۂ حسنِ قبول ‏ بند کر باب اثر میری دعا سے پہلے
میری عادت ہے وفا، ان پہ کچھ احسان نہیں ‏ تھا مجھے ذوقِ وفا ان کی جفا سے پہلے
وہ گھڑی کے لئے میزانِ عدالت ٹھہرے ‏ کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے
کچھ ادائیں ہیں حقیقت قتلِ عبث ہو منظور ‏ کچھ سزائیں ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے
تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے ‏ وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے
ہائے ان کا مری میت پہ یہ عذرِ تاخیر ‏ سو گئے تم مرے دامن کی ہوا سے پہلے
دارِ فانی میں یہ کیا ڈھونڈھ رہا ہے فانیؔ ‏ زندگی بھی کہیں ملتی ہے فنا سے پہلے

تیری قدرت کا نظارہ ہو مرا عجزِ گناہ ‏ تیری رحمت کا اشارہ ہے ندامت میری
تو تبسم بھی تحریکِ نگہِ ناز ہوا ‏ آج کچھ اور بڑھا دی گئی قیمت میری

میرا دل ہے کسی کی یاد کا نام ‏ محبت میری ہستی کا نشاں ہے
مسلم پرسشِ بیمار لیکن ‏ وہ شانِ چارہ فرمائی کہاں ہے

مجھی پر ہیں جفائیں چشمِ بد دور ‏ خدا رکھے وہ مجھ پر مہرباں ہے
پھر اب منظور ہے ہنگامۂ برق ‏ پھر اب قصدِ بنائے آشیاں ہے

یہ دل حریف تجلی ہی کیوں بنایا تھا | کہ جب یہ نقش دوئی بن گیا مٹا کے چلے
مگر نمود مشیت وجود تھا اپنا | رضائے دوست کو ہم آئینہ دکھا کے چلے
بلا کشوں کا تمھاری بلا کرے ماتم | جو غم اٹھانے کو آئے تھے ہم اٹھا کے چلے

سنگ نہیں سنگ در تو ہے ترک نہ کر نماز عشق
خاک جبیں سے کام لے سجدہ نہ لے جبیں سہی
سُن تو لیا ہے حالِ دل دیکھئے سن کے کیا کہیں
پھر مرے منہ کی بات ہے کیسی ہی دل نشیں سہی

بے ذوق نظر بزم تماشا نہ رہے گی | منہ پھیر لیا ہیں نے تو دنیا نہ رہے گی
کیا بھی کوئی دن مری قسمت میں ہے فانی | جس دن مجھے مرنے کی تمنا نہ رہے گی

کم ذرد جگر ہے یا بہت ہے | جو آپ سے مل گیا بہت ہے
پچھتائیں گے آپ دل کو لے کر | کم بخت غم آشنا بہت ہے
تکلیف جفا بھی کیوں کریں آپ | احسان غم وفا بہت ہے
کیا چاہیئے اور زندگی کو | مر رہنے کا آسرا بہت ہے

عشق کا نام کیوں کریں بدنام | زندگی بھی عذاب ہو کے رہی
بحر شوق کا مآل نہ پوچھ | سر بسر اضطراب ہو کے رہی
چشم ساقی کہ بھی کبھی مخمور | خود ہی آخر شراب ہو کے رہی

جل رہے ہیں آج تک دل کے چراغ — طور پر اک شمع جل کر رہ گئی
چن لیا تیری محبت نے مجھے — اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

حرم و دیر کی گلیوں میں پڑے پھرتے ہیں — بزم رنداں میں جو شامل نہیں ہونے پاتے
موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا — رُخ مگر جانب ساحل نہیں ہونے پاتے
دل تو سب کو تری سرکار سے مل جاتے ہیں — درد جب تک نہ ملے دل نہیں ہونے پاتے
تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر — نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے
کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے — ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے
ترا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو — مری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے
خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانی — آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

رسم بے دادِ دوست عام ہوئی
تلخیٔ زیست بھی حرام ہوئی

مری زندگی کی گھڑیاں تری دھن میں خوب گذریں
مری عمر کیسے کٹتی تری یاد اگر نہ ہوتی

کیوں پسِ مرگ یہ احساں اُٹھائیے
بے کسی کہہ دے جنازے پہ نہ آئے کوئی

کسی کو کیا مرے سود و زیاں سے — گرے کیوں برق بچ کر آشیاں سے

کچھ بس ہی نہ تھا ورنہ یہ الزام نہ لیتے — ہم تجھ سے چھپا کر بھی ترا نام نہ لیتے
کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی — اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

ان کی دل نوازی میں کوئی شک نہیں لیکن — ان کی دل نوازی کو لاگ ہے تمنا سے

دل کی جو حقیقت ہے، کیا کہیے، حسن بھی دل ہے عشق بھی دل
ہر شمع جلائی جاتی ہے پردے میں کسی پروانے کے

بجز اک دل پلٹ جانا نہ کرنا — یہ چالیں سیکھ لیں تم نے کہاں سے
بہت سر پیٹتی رہیں آرزوئیں — کوئی ناکام جاتا ہے جہاں سے

چونک پڑتے ہیں ذکر فانی سے — نیند اچٹتی ہے اس کہانی سے
تیری نامہربانیوں کی قسم — لاگ ہو دل کو مہربانی سے
حشر کو بھی ہو دور کی نسبت — چشم بد دور اس جوانی سے
کچھ خبر بھی ہے روٹھنے والے — زندگی روٹھتی ہے فانی سے

چلے بھی آؤ کہ دنیا سے جا رہا ہے کوئی — سنو کہ پھر نہ سنو گے تم التجا میری
خدا نے زہر کی تاثیر بخش دی فانی — ترس گئی تھی اثر کو بہت دعا میری

کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر — کچھ امید جواب میں گذری

تمہارا درد تو درماں بنا لیا ہم نے — اب اور سوچیے تدبیر دل دکھانے کی
زمانہ کفر محبت سے کر چکا تھا گریز — تری نظر نے پلٹ دی ہوا زمانے کی
پلٹ پلٹ کے قفس ہی کی سمت جاتا ہوں — کسی نے راہ بتائی نہ آشیانے کی

عشق ہو جب جنوں تو پھر شاد ہو اے دل حزیں — کوئی گلہ اٹھا نہ رکھ کوئی سوال رہ نہ جائے
تاب نظارۂ جلال حشر میں بخش کر مجھے — شان جمال بھی دکھا شان جلال رہ نہ جائے
اب جو ہوا ہوا مآل چھوڑ خدا پہ اندمال — زخم جگر پہ خاک ڈال تیر سنبھال رہ نہ جائے

داستانے چند	راز چاند پوری	2/-
زبان داغ	رفیق مارہروی	3/50
گل و صنوبر	"	1/25
ہندوؤں میں اردو	"	7/50
اردو شاعری کی ہندستانی روح	زرینہ ثانی	4/50
رباعیات دبیر	سرفراز حسین خبیر	1/-
رزم نامۂ دبیر	"	4/50
ادبی اشارے	ڈاکٹر سلام سندیلوی	4/50
ادب کا تنقیدی مطالعہ	"	3/50
اردو رباعیات	"	12/-
اردو شاعری میں منظر نگاری	"	10/-
شام و شفق	"	2/-
لمعات شاد	کلام شاد عظیم آبادی	2/-
خرمن	کلام شفیق جونپوری	2/-
سفینہ	" "	2/-
مخزن الاسرار	کلام حضرت جی خدا نما غمگین	3/-
سب رس	مرتبہ شمیم انہونوی	5/50
تصویر درد	" "	-/50
گذشتۂ لکھنؤ (عبدالحلیم شرر)	" "	5/-
مضامین فرحت اول	مرزا فرحت اللہ بیگ	3/-
تنقید اور انداز نظر	ڈاکٹر سیدہ جعفر	6/-

کتاب	مصنف	قیمت
مضامین لسان الصدق	عبدالقوی دسنوی	2/50
دیدۂ بینا	کوثر چاندپوری	4/-
جہان غالب	"	5/-
شاعرہ عالم ارواح	مرتضیٰ حسین موسوی	4/-
نقش میر	مسعود حسن رضوی	1/50
تاریخ دولت ہسپانیہ عرب کامل	مولوی محمد صدیق	12/-
تلمیحات	محمود نیازی	6/-
پنجاب میں اردو	محمود شیرانی	8/
ہندستانی لسانیات	محی الدین قادری زور	3/-
ایک تھا شاعر	مظفر حنفی	12/
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	15/
شاد عظیم آبادی	نقی احمد ارشاد	8/-
عروض نغمہ	نیاز فتح پوری	1/25
مشکلات غالب	نیاز فتح پوری	2/50
نگارستان	"	4/-
باقیات غالب	وجاہت علی سندیلوی	3/-
عبدالباری آسی	وصی احمد سندیلوی	2/25
طوطی نامہ	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	2/-
سراپا سوز	"	1/35

ملنے کا پتہ

بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ